اقبال شوقی

جناب حمید الدین شاہد
نذر
اقبال شوقی
9/1/72

آئینۂ اعتبار

اقبال شوقی

ب

بار اول ـ ——— نومبر ۱۹۷۱ء

تعداد اشاعت ——— ۱۱۰۰

قیمت ——— بارہ روپے (۱۲)

ناشر ——— مکتبۂ دانیال کراچی

مطبع ——— جاوید پریس ۔ کراچی

خطاط ——— منشی رضا حسین

سرورق ——— ساجد رضوی

جاوید پریس ۔ کراچی

ایک پردہ نشین کے نام

ہر غنچہ کو محوِ جستجو پایا ہے
ہر گُل کو ہمہ تن آرزو پایا ہے
شوقِ رُخِ امکاں سے جو اُلٹا ہے نقاب
اک پردہ نشیں کو رُوبرو پایا ہے

۸

جذبات کو تخئیل میں سمو دیتا ہوں
احساس میں نشتر سے چبھو دیتا ہوں
اسرار کو بخشتا ہوں الفاظ کا روپ
ابہام کو تکنیک میں ڈبو دیتا ہوں

کیا فرق ہے نور و نار میں اے ساقی؟
کیا شے ہے نگاہ یار میں اے ساقی؟

آئینۂ اعتبار ہے ہر عالم
نظارہ ہی کس شمار میں اے ساقی؟

تقریظ

از پروفیسر مجنوں گورکھپوری

رباعی کی صنف متقدمین سے متأخرین تک شاعری کی بہت مقبول صنف رہی ہے۔ فارسی اور اردو شاعری کے اساتذہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے سو پچاس یا دس پانچ رباعیاں بھی نہ کہی ہوں۔ معدودے چند شعرا ایسے بھی ہیں جنھوں نے رباعی کے سوا شعر کی کسی دوسری صنف کی طرف یا تو سرے سے توجہ ہی نہیں کی، یا اگر کی بھی تو رباعی کے سوا کسی صنف میں کوئی ایسا کارنامہ نہیں چھوڑا جو یادگار ہو۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رباعی سے وہ صنفِ سخن مراد ہے جس کو عروضیوں کی اکثریت نے رباعی کہا ہے اور جس کے دائرے میں نہ باباطاہر عریاں اور اقبال کے ترانے آتے ہیں اور نہ بحرِ ہزج اور اخرم کے چہار رکنی دو اشعار کے سوا کسی دوسری بحر یا وزن کے دو اشعار آتے ہیں۔

غزل کے بعد رباعی ہی کی صنف ایسی ہے جس میں کسی اہم فکری لمحے یا حسّی تجربے کو ایک توانا اکائی بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ غزل کے دو مصرعوں میں یہ فکری توانائی پیدا کرنا پڑتی ہے اور رباعی کے چار مصرعوں میں اگر یہ توانائی مفقود ہے تو غزل کے دو مصرعے بھی بے اثر ہیں اور رباعی کے چار مصرعے بھی بے جان ہیں۔ روایتی اصنافِ سخن میں غزل کی طرح رباعی بھی جتنی سہل اور عام رہی ہے اتنا ہی اس کا فن مشکل ہے جو خاص مزاج اور صلاحیت رکھنے والوں کے لئے موزوں اور مناسب ہے۔ ویسے غزل کے سستے اور کھوکھلے اشعار کی طرح روزِ اوّل سے بے مغز اور تیسرے درجے کی رباعیوں کی کمی نہیں رہی ہے۔

غزل کی طرح رباعی کا بھی ایک مزاج ہے اور وہ ایک خاص مزاج ہی کے شاعر کے لئے سزاوار ہو سکتی ہے فارسی اور اردو میں بہت سے اساتذہ گذرے ہیں جو فنِ شعر گوئی کے ماہر ہوئے ہیں اور جو نہ صرف غزل اور رباعی میں یادگار کارنامے چھوڑ گئے ہیں بلکہ قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی میں بھی ان کے نام ثبت ہیں۔ لیکن ایسے شعرا گنتی کے نکلیں گے جنھوں نے صرف رباعی کو اپنا فن بنایا ہو۔ فارسی میں تو کچھ نام ایسے مل بھی جاتے ہیں جنھوں نے نظم کی دوسری صنفوں میں

جتنا کچھ بھی لکھا ہو لیکن ان کے نام آج صرف رباعیات کی بدولت زندہ ہیں۔ اُن میں ابوسعید ابوالخیر، عمر خیام، سرمد اور ابوالوفا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو میں متقدمین سے معاصرین تک اکثر اساتذہ نے رباعیاں کہی ہیں جو فکر اور فن دونوں کے اعتبار سے اردو شعر گوئی کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیجا سکتیں۔ درد، سودا، میر اور غالب سے انیس، حالی اور اکبر تک اور اکبر سے تا حال اردو کا کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں ہوا جس نے رباعیاں نہ کہی ہوں اور جس کی رباعیاں قابلِ لحاظ نہ ہوں۔ ہمارے معاصرین میں جوش اور فراق رباعی میں ارکان اربعین کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جن اکابر کے نام گنائے گئے ہیں ان میں سے کسی کے بارے میں یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ صرف رباعی کا شاعر ہے یا اس کا فطری اور اصلی ہنر رباعی ہے۔ سب نے رباعی کو اپنا ذیلی مشغلہ رکھا ورنہ ان میں سے ہر ایک کا خاص فن کچھ اور ہے۔ درد، سودا، میر اور غالب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ میر انیس کا اصلی فن مرثیہ ہے۔ حالی نے غزل اور نظم میں اپنا بہترین کمال دکھایا۔ اکبر کا مزاج اور طبعی فن مزاح اور طنز تھا جس میں انہوں نے اپنا منفرد انداز اختیار کر کے ناموری حاصل کی۔ جوش نے غزلیں بھی کہی ہیں اور کہتے ہیں لیکن وہ دراصل بیانیہ نظم کے شاعر ہیں۔ چونکہ وہ زبان پر قدرت رکھتے ہیں اس وجہ سے ان کی رباعیوں میں بھی تکلم کا زور ہے۔ فراق غزل اور صرف غزل کے شاعر ہیں۔ لیکن وہ ایک نابغہ (GENIUS) ہیں اور خلاق تخیل اور بلیغ فکر کے مالک ہیں۔ اس لئے جب بھی جس میدان میں چل پڑتے ہیں اپنے احساس کی شدت اپنی فکر کی توانائی اور اپنے تخیل کی اُپج کی بدولت اپنا انفرادی انداز پیدا کر لیتے ہیں اور ان کے نقشِ قدم اُجاگر رہتے ہیں جو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ انھوں نے رباعی کو "شرنگار رس" کے لئے وقف کر لیا ہے اور ابتدائی دور کی رباعیوں کو چھوڑ کر اُن کی تمام رباعیاں لمسیات کے بہترین نمونے ہیں جن کا حجم خاصا ہے۔

اردو شعراء میں اب تک ہمیں صرف دو ایسے ملے ہیں جن کے بارے میں قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ رباعی کا مزاج لے کر پیدا ہوئے ہیں اور ان کا فکری جوہر رباعی ہے۔ میری مراد جگت موہن لال رواں اور امجد حیدرآبادی سے ہے۔ رواں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور خاصی تعداد میں کہی ہیں لیکن ان کی غزلوں میں وہ

حُسن نہیں ملتا جو اُن کی رباعیوں میں ہے۔ اور آج جب ہم کو اُن کی یاد آتی ہے تو معاً ذہن اُن کی رباعیوں کی طرف جاتا ہے۔ امجد نے بھی دوسری صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن فکر کی جو توانائی اور احساس کی جو شدت اُن کی رباعیوں میں محسوس ہوتی ہے ان کے کلام میں کہیں اور محسوس نہیں ہوتی۔ اس کا راز یہی ہے کہ امجد کو جو طبعی مناسبت رباعی سے تھی وہ کسی اور صنف سے نہیں تھی۔

اگر میں اپنے مُطالعے اور حافظے پر اعتماد کر سکتا ہوں تو سید اقبال حُسین شوؔقی اردو شاعری میں تیسرے شخص ہیں جنھوں نے رباعی کو اپنا خاص فن بنایا اور اسکو ایک مستقل و مخصوص فن کی حیثیت سے اختیار کیا ہے اقبال شوؔقی ایک مدت سے شعر کہتے ہیں اور رباعی سے ان کو بڑا شغف ہے لیکن گذشتہ دس پندرہ سال سے میرے لیے کسی کا محض ادیب یا شاعر ہونا کچھ اہمیت نہیں رکھتا اور میں کسی کی طرف صرف اس لئے مائل نہیں ہوتا کہ وہ شاعر یا ادیب ہے۔ اب جب کوئی شاعر یا ادیب کی حیثیت سے میرے سامنے آتا ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اسکے اندر مہذّب اور معقول انسانیت کتنی ہے۔ چنانچہ اقبال شوؔقی کو بھی میں نے پہلے اس میزان پر تولا اور میں یہ کہتے ہوئے اپنے اندر ایک انبساط پاتا ہوں کہ اقبال شوؔقی میری میزان پر پورے اترے۔ وہ بے انتہا مہذّب اور بے ریا انسان ہیں۔ ان کا دل خلوصِ جذبات سے معمور ہے مگر ان کے حرکات و سکنات اور ان کی رفتار و گفتار میں ہمیشہ ایک سنجیدگی ہوتی ہے۔ انہوں نے حساس دل کے ساتھ بڑا شفاف دماغ پایا ہے۔ ان کی جن خصوصیات نے مجھے متاثر کیا ہے وہ ان کی طبیعت کی پاکیزگی، ان کے مزاج کا اعتدال، ان کے کردار کی صداقت اور ان کے فکر و عمل یعنی ظاہر و باطن کی ہم آہنگی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کی ان خصوصیات میں ہمواری اور استقامت پائی جاتی ہے۔

اقبال شوؔقی ایک طرف فکر و تامل کی خداداد قابلیت رکھتے ہیں جس کو وہ اپنے مخصوص مطالعے سے جلا دیتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ بڑے خوش تدبیر صاحبِ سعی و عمل ہیں۔ ان کی تیسری خوبی جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اُن کی دوستداری ہے۔ وہ بڑے دوستدار اور دوست نواز آدمی ہیں لیکن کیا فکر و تامل

میں کیا سعی وعمل میں وہ ایک مخصوص دائرہ رکھتے ہیں جس کے اندر وہ فرزانگی اور توازن کے ساتھ زندگی گذارتے ہیں اسطرح اُن کے دوستوں کا حلقہ بھی مخصوص و محدود ہے۔ ویسے اقبال شوقؔ سبھی سے نیک مزاجی اور خوش اخلاقی کے ساتھ ملتے ہیں لیکن وہ اپنے تپاک اور خلوص کو کچھ گنے چُنے دوستوں تک محدود رکھتے ہیں اور یہاں بھی اُن کے طرزِ عمل میں کہیں ربودگی یا ازخود رفتگی نہیں ملے گی بلکہ وہی توازُن اور عناں گسیختگی محسوس ہوگی جو اُن کے مزاج کی مستقل خصوصیت ہے۔

ایسے لوگ بالعموم اپنے سوچے سمجھے خیالات وعقائد رکھتے ہیں جن کا وہ اظہار کریں یا نہ کریں ان میں وہ پختہ اور راسخ ہوتے ہیں اور خاموشی کے ساتھ ان پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اقبال شوقؔ بھی زندگی اور زندگی کے مختلف مسائل پر غور کرتے رہتے ہیں اور ان کے متعلق اپنے جچے تُلے افکار و نظریات رکھتے ہیں جو بہت بڑی حد تک اُن کی عملی زندگی میں بھی داخل ہیں اور ان کے اندر ایک تحریکِ اظہار بھی ہے۔ لیکن چونکہ شورش اور شوریدگی سے اُن کے مزاج کو موانست نہیں ہے اور طولِ کلام سے وہ گریز کرتے ہیں اس لیے جب کبھی وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی آواز اور اُن کے لہجہ میں متانت اور سنجیدگی ہوتی ہے۔ وہ خواہ مخواہ کسی کو اپنا ہمخیال بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اُن کو اپنے خیال کا سلیقہ اور شائستگی کے ساتھ اظہار کر دینے سے کام ہوتا ہے اور بس۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اقبال شوقؔ شعر و ادب سے فطری شغف رکھتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ خاصا وسیع ہے اور ان کے اندر شعر کہنے کا ذوقِ سلیم بھی ہے۔ اس ذوق کی تسکین کے لئے اُنھوں نے نظم کی وہ مخصوص صنف اختیار کی ہے جو اصطلاح میں رُباعی کہلاتی ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رباعی کو ان کے مزاج سے خلقی مناسبت ہے۔ اقبال شوقؔ نے نظم کی اور صنفوں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ رباعیات کے علاوہ بھی میں نے ان کے اشعار سُنے ہیں۔ یہ اشعار بھی اچھے ہیں اور شعر گوئی کی مہارت پر دلالت کرتے ہیں لیکن میں پھر کہوں گا کہ وہ رباعی ہی کے شاعر ہیں۔ ان کا شعورِ شعری رباعی کا متقاضی ہے اور رباعی اُن کے سالم کردار اور ان کی صالح طبیعت کی آئینہ داری کرتی ہے۔

اقبال شوقی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رباعیات کی کافی تعداد میری نظر سے گذر چکی ہے اور میں نے ان کو غور سے پڑھا ہے۔ سب سے پہلا اثر تو مجھ پر وہی ہوا جس کا اظہار میں نے تکرار اور اصرار کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی وہ رباعی کے شاعر ہیں۔ اگر وہ رباعیاں نہ کہتے ہوتے اور مجھ سے مشورہ لیا جاتا تو میں یہی کہتا کہ وہ رباعی اور صرف رباعی کہیں۔ ان کا شعور مجذوبانہ (RHAPSODIC) نہیں بلکہ فکری ہے اور قدرے وضاحت چاہتا ہے۔ لیکن وہ استقرائی بھی نہیں کہ طویل تفصیل اور مرتب استدلال کا متحمل ہو سکے۔ ایسے شعور کے اظہار کے لئے واضح اجمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ اگر نظم کی کسی صنف میں اپنے کو ظاہر کر سکتے ہیں تو وہ رباعی یا ترانہ یا انگریزی کا اسٹینزا (STANZA) ہی ہے۔ مجھے اقبال شوقی کی جو رباعیاں پسند ہیں ان میں سے چند پیش کر رہا ہوں تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے۔

تجھ میں بھی شعورِ غم جگا دوں تو سہی　　تجھ کو بھی غم آشنا بنا دوں تو سہی
بیچارگیٔ شوق پہ ہنسنے والے　　میں شوق کو بھی ناز سکھا دوں تو سہی

ہر نقش کو سینے سے لگا لیتا ہوں　　بُت ساز ہوں بُتکدے سجا لیتا ہوں
یادوں سے عبارت ہے شبستانِ خیال　　یادوں کے مجسمے بنا لیتا ہوں

بُت گر ہوں صنم پرست ہوں اے ساقی　　اک رندِ سیاہ مست ہوں اے ساقی
شاہد بکنار و ساغرِ بادہ بدست　　بیگانۂ بود و ہست ہوں اے ساقی

سُرخی ہی نہیں رنگِ حنا میں تنہا　　شوخی ہی نہیں گل کی ادا میں تنہا
ہے لرزشِ پوشیدۂ رنگ و بو بھی　　مستی ہی نہیں رقصِ صبا میں تنہا

ان رباعیوں سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور گرمِ تماشا ہیں۔ وہ ہر نقشِ وجود سے صحیح اثر قبول کرتا ہے جو محض انفعالی نہیں ہوتا بلکہ شاعر کے نفس میں پہنچ کر خود

فعال ہو جاتا ہے۔ شاعر مشاہدے اور مطالعے کے ذریعہ خارجی دنیا سے مواد فراہم کرتا ہے اور اپنے فکر و تخیل سے کام لے کر اپنے ذوق و نظر کے مطابق اپنے لئے بُت تراش لیتا ہے لیکن وہ صرف بُت تراش نہیں ہے وہ اپنے تراشے ہوئے بُتوں سے بُت کدہ سجانے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے جو بُت تراشی کی قابلیت سے کم اہم نہیں۔ یہ سلیقہ خود اپنی جگہ ایک تخلیقی صلاحیت ہے اور اس کے لیے بھی تخیل کی ضرورت ہے۔ اگر یہ سلیقہ نہ ہو تو تراشے ہوئے بتوں کا ڈھیر تو لگ سکتا ہے، ان سے بت کدہ نہیں سجایا جاسکتا۔

اقبال شوؔقی احساس و فکر کی اپنی ایک کائنات رکھتے ہیں اور اس کائنات کو ایک خاص ہیئت میں پیش کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے لئے رباعی کی صنف منتخب کی ہے اور وہ رباعی کے عروضی نکات اور ایقاعی رموز سے اچھّی طرح واقف ہیں۔ ان کے اپنے افکار و خیالات سے قطع نظر کر کے اُن کی رُباعیات کو پڑھ جائیے تو محسوس ہوگا کہ وہ رباعی کی میزان پر بھرپور تُلی ہوئی ہیں اور خوش آہنگ ہیں۔ جو مثالیں ابھی پیش کی گئی ہیں ان سے میرے قول کی تصدیق ہوتی ہے اور آگے جو مثالیں پیش کی جائیں گی اُن سے بھی یہی ثابت ہوگا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ اقبال شوؔقی زندگی اور اس کے مسائل و معاملات پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ہر مسئلے میں انہوں نے اپنے طور پر سوچا ہے اور کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں اور اس کا اظہار اپنے مخصوص پیرایے میں کیا ہے جو بے کیف نہیں ہے۔ حمد و ثنا، نعت و منقبت، غیب و شہود، فنا و بقا، زمان و مکان، عشق و معرفت، جسمانی حساسات اور روحانی کیفیات اقبال شوؔقی کے یہاں سبھی کچھ ملے گا۔ لیکن جو خصوصیات اپنا پائدار نقش چھوڑتی ہیں وہ دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر اپنی اندرونی تحریک کے تقاضے کی بنا پر ابلاغ چاہتا ہے۔ لیکن تبلیغ سے بڑی احتیاط کے ساتھ پرہیز کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ابلاغ کے قرینے سے واقف ہے اور اس کی آبرو رکھنا بہرحال اپنا طبعی فرض سمجھتا ہے

ضروری نہیں کہ کسی شاعر یا مفکّر کے سارے تاثرات و تاملات سب کے لئے یکساں قابلِ قبول ہوں۔ لیکن اسکے اظہار کے پیرایے کو بہر صورت دلاویز ہونا چاہیے۔ کچھ اور رباعیاں درج کی جارہی ہیں جو بلا کسی اہتمام والتزام کے اِدھر اُدھر سے لی گئی ہیں اور جو مختلف مضامین پر مشتمل ہیں۔

افسوں گریٔ جام گئی، پر نہ گئی　　نیرنگیٔ اصنام گئی، پر نہ گئی
جینے کی تمنا ہی رہی جیتے جی　　دل سے ہوسِ خام گئی، پر نہ گئی

افسوں زدۂ اہرمن و یزداں ہوں　　زحمت کشِ صد نازشِ این و آں ہوں
دل میں ہے عجب کشمکشِ ظلمت و نور　　انساں کی جستجو میں سرگرداں ہوں

ہر راز کے بعد دوسرا پاتے ہیں　　رازوں کا بھی ایک سلسلہ پاتے ہیں
پایا جو تجھے تو خود کو کھو بیٹھے ہم　　ہر گام پہ مرحلہ نیا پاتے ہیں

اِک درد کہ جس کی کوئی تفسیر نہیں　　اِک شوق کہ جس کی کوئی تدبیر نہیں
یہ میری وفا، یہ آپ کی بے مہری　　اِک خواب کہ جس کی کوئی تعبیر نہیں

پندار کی مستی سے کہاں تک پہنچے　　اقدار کی پستی سے کہاں تک پہنچے
رشتہ اپنا فراعنہ سے جوڑا　　اجداد پرستی سے کہاں تک پہنچے

شوقِ صبر آزما ہے ہستی کیا ہے　　فنکار کا حوصلہ ہے ہستی کیا ہے
ہردم متحرک، متخالف، متضاد　　اک حسن گریز پا ہے ہستی کیا ہے

اک ذرّۂ بے بود بھی بے بود نہیں　　اک قطرۂ محدود بھی محدود نہیں
نسبت ہو اگر کُل سے تو ہر جزو بھی کُل　　ورنہ کوئی موجود بھی موجود نہیں

رباعی کی ساخت پر اگر غور کیا جائے اور اب تک جتنی رباعیاں فارسی اور اردو میں کہی گئی ہیں ان کو سامنے رکھا جائے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ معنوی اعتبار سے بھی اس کے کچھ تقاضے ہیں۔ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ رباعی کے چار مصرعوں میں ایک پوری بات کہی جاتی ہے جس کو سب سے زیادہ تقویت آخری مصرعہ سے ملتی ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ رباعی میں جو بات کہی جائے وہ کس عنوان کی ہو۔ ظاہر ہے کہ شاعر ایک فرد ہوتا ہے اور اس کی ذات اور شخصیت ہوتی ہے اور وہ جو کچھ کہے گا وہ اسکا تجربہ یعنی ذاتی تاثر یا تخیل یا شعور ہوگا جس کی ترکیب و تشکیل میں اسکی فردیت بھی ایک اہم جزو کی حیثیت سے داخل ہوگی۔ لیکن اگر شاعر اپنی ذات میں اتنا محو ہے کہ اسکو اٹھارہ ہزار عالم اور ساری حیاتِ انسانی کا محور سمجھتا ہے تو وہ خود اپنے لئے جو کچھ بھی ہو دوسروں کو وہ کچھ نہیں دے سکتا۔ شاعر کی تخلیق میں ایک زندہ اور توانا ذات کی کارفرمائی کا احساس ضرور ہونا چاہئے لیکن ذات کا غلبہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہر شاعر کے لئے یہ احتیاط ضروری ہے۔ لیکن رباعی کے شاعر کو خصوصیت کے ساتھ اس کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ رباعی میں جو تاثرات یا تصورات پیش کئے جائیں ان میں تمام انفرادیت کے ساتھ ایک جامعیت، ایک ہمہ گیری کا شعور ہونا چاہئے۔ اقبال شوقی کی رباعیاں اس نقطۂ نظر سے بھی فن کے کامیاب نمونے ہیں۔ وہ جن واردات اور لمحات سے گذرتے ہیں اور قلب اور ذہن پر جو ارتسامات اور تصورات مرتب ہوتے ہیں انکو وہ کائناتی اور عام انسانی فطرت کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی رباعیوں میں وہ جامعیت یا کلیت (UNIVERSALITY) ہوتی ہے جس کو اس فن کا طبعی تقاضا بتایا گیا ہے۔ مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی ذات میں کھویا ہوا نہیں ہے اور اسکے اندر یہ قابلیت ہے کہ وہ بے نفسی کے ساتھ اپنے ذاتی احساسات و افکار میں کائنات اور حیاتِ انسانی کی ہمہ گیر اور پائیدار قدروں پر نظر رکھے اور اپنے انفرادی اسلوب میں ان کا اظہار کرے۔ جو رباعیاں پیش کی جا چکی ہیں وہ اِس خصوصیت کی حامل ہیں دو چار رباعیاں اور سنئے۔

احساسِ غمِ دہر مٹانے کے لیے دنیا میں مسرتیں بڑھانے کے لیے
اِک لمحۂ زندگی غنیمت ہے اگر ہو پھول کی طرح مُسکرانے کے لیے

با غمزۂ خواجگی گذر جاتی ہے با نازشِ بندگی گذر جاتی ہے
کیفِ گذراں ہو رنج و راحت اے دل ہر طور سے زندگی گذر جاتی ہے

ہر چیز یہاں کی ہے سراسر دھوکا ہر لمحہ بدلتی ہے یہ دُنیا کیا کیا
تو ساتھ ہو تو دشت میں جی لگتا ہے تو پاس نہ ہو تو گلستاں بھی صحرا

دل کی کشتی کے ناخدا ہیں ہم لوگ غم کی منزل کے رہنما ہیں ہم لوگ
کافی ہو اسی قدر تعارف شوقی منجملۂ اربابِ وفا ہیں ہم لوگ

ہرگز نہ کبھی شکوۂ بیداد کیا اکثر ترے تذکروں سے دل شاد کیا
قصداً ابھی کبھی کبھی بھلانا چاہا بے قصد بھی بارہا تجھے یاد کیا

رباعی کا دوسرا فطری تقاضا متانت اور سنجیدگی ہو۔ مضامین یا اسالیب میں سخافت یا سُبکی اسکے مزاج کو راس نہیں آسکتی، تمسخر اور تضحیک، ظرافت و استہزا، رباعی کے آداب سے دُور ہیں۔ فارسی یا اُردو میں اس فن کے جتنے اکابر گزرے ہیں ان کی بہترین رباعیاں اس دعوے کی تصدیق کریں گی۔ رباعی زیادہ سے زیادہ اس طنز کی متحمل ہوسکتی ہے جو پُر تأمل ہو اور لطیف اور نازک انداز رکھتا ہو اور جو اسکی فکری کائنات کی ترکیب میں لازمی جزو کی حیثیت سے داخل ہو۔ رباعی میں طنز کا سب سے بڑا ماہر عمر خیام ہو اور اس کا طنز اُس کے نظامِ فکر کا لازمی ترکیبی عنصر ہوتا ہو۔ اقبال شوقی کی رباعیاں بھی متین اور متوازن ہوتی ہیں۔ نہ تو ان میں مضامین کے اعتبار سے کسی قسم کا ہلکا پن

ہوتا ہے اور نہ زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے کسی طرح کی سبکی ہوتی ہے۔ وہ خود بڑے سنجیدہ اور پُر وقار آدمی ہیں اور باتیں بنانا ہنسی مذاق میں وقیع اور اہم باتوں کو اڑا دینا اُن کی افتادِ طبیعت نہیں۔ کہیں کہیں ان کی رباعیوں میں بھی طنز ملتا ہے۔ لیکن یہ طنز ان کی عام رفتار و گفتار کی طرح جچا تُلا ہوتا ہے اور ان کے نستعلیق مزاج و کردار کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ اُن کا طنز بھی اُن کی فکرِ سلیم اور شعورِ مستقیم کے ساتھ گھل کر ایک انفرادی انداز اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً

اپنی تو گزر جاتی ہے جیسے گزرے
اوروں کے مصائب نہیں دیکھے جاتے
میں بندۂ ناچیز ہوں یا رب لیکن
کر لیتے ہیں آپ یہ گوارا کیسے!

گُل ہنستے ہیں اور گلستاں ہنستے ہیں
مہر و مہ و نجم و کہکشاں ہنستے ہیں
ہے شیوۂ تسلیم و رضا خوب مگر
مجھ پر مرے سجدوں کے نشاں ہنستے ہیں

یزداں بھی ہے اہرمن بھی ہے برسرِ کار
دونوں کی نظر میں آدمی لائقِ دار
تحریصِ بہشت ہو کہ دوزخ کا خطر
ہر کاوشِ خیر و شر ہے احساسِ آزار

ہر سمت مسرت کی نمائش ٹھیری
بے باکیِ دل وجہِ ستائش ٹھیری
نعمت بھی کسوٹی ہے عقوبت بھی عیاں
کیوں عمرِ عزیز آزمائش ٹھیری؟

تسلیم و رضا کی کوئی تعبیر تو ہو
منشورِ وفا کی کوئی تفسیر تو ہو
تعمیرِ انا ہے اقتضائے ہستی
ہستی کی بقا کی کوئی تدبیر تو ہو

یہ نفس یہ ذات کیا ہے معلوم تو ہو
یہ نقشِ حیات کیا ہے معلوم تو ہو
کیوں تابعِ گردشِ فلک ہے مری خاک
تدبیرِ نجات کیا ہے معلوم تو ہو

اِس میکدۂ عجب سے کیا حاصل ہے　　　اِس شعبدۂ طرب سے کیا حاصل ہے
گلشن میں رہیں اور گُلوں کو نہ چھوئیں　　　اس حسرتِ روز و شب سے کیا حاصل ہے

اک عالمِ ایجاد کہ موجود بھی ہے　　　اِک عالمِ اضداد کہ مشہود بھی ہے
ان سے بھی اگر نجات پا جائیں تو　　　اک عالمِ بیداد کہ موعود بھی ہے

اقبال شوقی نے سلسلہ وار رباعیاں بھی کہی ہیں سلسلہ وار سانیٹ کی طرح سلسلہ وار رباعیات کے لئے بھی ایک ہنرمندی درکار ہے۔ اس کا اصلی ہنر یہ ہے کہ سلسلہ کی ہر رباعی اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہو اور سلسلے کی تمام رباعیوں کے ساتھ مل کر ایک وسیع تر فکری کُل کا ایک لازمی جزو ہو۔ اس وقت صرف ایک فارسی رباعی گو شاعر یاد آرہا ہے جو مسلسل رُباعی کے فن میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ میری مراد ابو سعید ابوالخیر سے ہے۔ اسکی تمام رباعیاں باہم ایک سلسلہ ہیں لیکن اسکی ہر رباعی اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے۔ اردو میں فراق کی لمسیاتی رباعیاں بھی کچھ اسی انداز کی ہیں اقبال شوقی نے جو سلسلہ وار رباعیاں کہی ہیں وہ حجم میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن وہ جتنی بھی ہیں قرینے کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ ان میں ہر رباعی ایک مفرد مضمون ہے اور کئی رباعیاں مل کر ایک مرکب سلسلہ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

غنچہ کہ شمیمِ جانفزا کو ترسے　　　تارا کہ شعاعِ پُرضیا کو ترسے
مفہوم کہ تشنہ لبِ گویا کے لئے　　　لب تشنہ کہ حرفِ مدعا کو ترسے

نرگس کہ نگاہِ سُرمہ سا کو ترسے　　　سوسن کہ کفِ گُل آشنا کو ترسے
اک کنج کہ بُلبل کے لئے چشم براہ　　　اک خار کہ آبلہ بہ پا کو ترسے

غم عینِ خوشی ہے تو مسرت کیا ہے
زحمت ہی مقدر ہے تو رحمت کیا ہے

ہم عکس بھی ہیں سایہ بھی لاشئ بھی تو پھر
یہ حسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے

ہے جبر کہ اختیار فطرت کیا ہے
اس خاک کے پُتلے کی جبلّت کیا ہے

بالیدگئ انا سے فطرت کو ہے کد
یہ حُسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے

تن اور بدن کی قدر و قیمت کیا ہے
اس تن کے بغیر جاں کی صورت کیا ہے

ہستی بھی عدم بھی ارتقا کی منزل
یہ حسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے

اقبال شوقی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ایسی دو طرفہ کم نظری کے دور میں جب کہ قدیم و جدید کے قصّے کو غیر ضروری طوالت دے کر دل و دماغ کی قوّتیں ضائع کی جا رہی ہوں۔ انھوں نے نظم کی ایسی مشکل صنف کو اپنا مستقل فن بنایا ہے اور اسکے ناموس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے مزاج اور اپنے دور کے مزاج کی بھی آبرو برقرار رکھنے کی پُرخلوص کوشش کی ہے

تعارف

از ڈاکٹر فرمان فتحپوری

کہا جاتا ہے کہ غزل بڑی کٹر صنفِ سخن ہو لیکن رباعی تو کٹر سے کٹر ہے۔ اس کا کٹر پن ایک گو نہ نہیں چہار مصراعی ہونے کے سبب چہار گونہ ہو۔ اسے اردو فارسی کی مختصر ترین نظم بھی کہہ سکتے ہیں، اس لیے کہ اسمیں صرف چار مصرعے ہوتے ہیں اور ان میں ایک خاص ربط کے ساتھ کسی منظم خیال یا فکر کو وجدانی تاثر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہو۔ مصرعوں کی تعداد کی طرح رباعی کے قافیائی نظام پر بھی پابندیاں ہیں رباعی کے تیسرے مصرعے میں قافیہ لانا اختیاری اور پہلے دوسرے اور چوتھے میں قافیہ کا استعمال لازمی ہو۔ اس سے بڑھکر یہ کہ رباعی کی بحر اور وزن مخصوص ہو۔ رباعی اپنے مخصوص وزن کے سوا کسی اور وزن میں نہیں کہی جا سکتی۔ یہ تو رباعی کی ظاہری یعنی اسکی ہیئت کی پابندیوں کا ذکر تھا۔ لیکن اسکی معنوی پابندیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ بات یہ ہے کہ رباعی اپنے موضوعات و اسلوب کے اعتبار سے نظم اور غزل دونوں کی مشترکہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہو۔ ایک مرکزی خیال یا وحدتِ فکر کی ترجمانی کے لحاظ سے آپ اسے نظم کہہ سکتے ہیں لیکن جب تک اس کا اندرونی لب و لہجہ غزل کی طرح نرم، لطیف، شیریں اور پہلو دار نہ ہوگا یہ چہار مصراعی نظم بظاہر رباعی تو ہوگی مگر رباعی نہ سمجھی جائے گی۔ شاعری کی شاید ہی کوئی اور صنف ایسی ہو جو اس طرح فنی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہو۔

رباعی کی ان فنی مشکلات کے سبب اردو فارسی کے شعراء میں چند ایک کے سوا کوئی شاعر ادبی تاریخ میں ایسا نقش نہ بنا سکا جو کہ قصیدہ نویسوں اور غزل نگاروں کے نقوش کی طرح اَنمٹ ہو۔ فارسی شعراء میں ہر ایک نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ جملہ اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کر سکتا ہو رباعیاں بھی کہی ہیں لیکن مولانا ابو سعید ابو الخیرؒ

خیام اور سرمد کے سوا کسی کو رباعی نگار کی حیثیت سے شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ اردو کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں کوئی غزل میں ممتاز ہے۔ کوئی قصیدے میں کسی کو مثنوی کی بدولت شہرت حاصل ہے کسی کو مرثیہ کے سبب، حتیٰ کہ مسدس، قطعہ، واسوخت اور ریختی جیسی صنفوں میں بعض شعرا نے اپنے امتیازی نشانات بنائے ہیں لیکن کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جس نے رباعی گوئی کی بدولت کوئی ممتاز مقام حاصل کر لیا ہو۔ آپ ایک دو کا نام لینے کے لئے شاید بے چین ہوں گے۔ میں ان کی طرف آرہا ہوں۔

اس سے انکار نہیں کہ حالی، اکبر، انیس اور دبیر نے اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں اس صنف کی جانب کچھ زیادہ توجہ کی ہے۔ اور ان کے ذریعے رباعی کے موضوعات کو وسیع کرنے اور اسے خلوت خانے سے نکال کر مجلس و مشاعرہ تک لانے میں مدد بھی ملی ہے۔ لیکن اتنی بات تو بہر حال آپ تسلیم کریں گے کہ ان میں سے کسی کا طرۂ امتیاز رباعی نہیں ہے۔ حالی کی شہرت مثنوی نما جدید نظموں اور مسدس پر قائم ہے۔ اکبر کے یہاں رباعی سے کہیں زیادہ قطعات و منظومات کو اہمیت حاصل ہے۔ انیس و دبیر بنیادی طور پر رباعی گو نہیں ہیں مرثیہ نگار ہیں۔ ان کے شاعرانہ جوہر رباعی میں نہیں، مرثیے میں کھلتے ہیں۔ چنانچہ ان کی عظمت و شہرت کا مدار رباعی پر نہیں، مرثیے پر ہے۔

عہدِ حاضر کے جن بزرگ شعرا نے دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ رباعی کی جانب بھی توجہ کی ہے۔ ان میں جگت موہن لال رواں، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور امجد حیدر آبادی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے رواں اور محروم بہ حیثیت رباعی نگار تقریباً گمنام ہیں۔ خواص کے سوا ادب کے عام قاری شاید اس بات سے بھی واقف نہ ہوں کہ وہ اس صنف میں کوئی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ رہے جوش اور فراق سو انھیں یقیناً عام و خاص دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے ذریعے رباعی کے تنِ لاغر کو تازہ خون ملا ہے۔ اسکے چہرے پر تازگی آئی ہے اور اس تازگی کے سبب رباعی نے ہمارے شعرا اور قارئین دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ جوش کا میدان نظم اور

اور فنی مہارت کی بنا پر وہ روزانہ کچھ نہ کچھ تازہ رباعیاں کہہ لیتے ہیں۔ اور اسطرح تیس سال کی مشق سخن میں انہوں نے رباعیات کا ایک بڑا سرمایہ جمع کر لیا ہے۔ اس سرمایہ کا تھوڑا سا حصہ انہوں نے بڑی خاموشی سے "صحیفۂ دل" کے نام سے کئی سال پہلے شائع بھی کر دیا ہے لیکن اسکے باوجود جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں بہت ممکن ہے کہ بعض نے انکا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ انکا نام کوئی سن بھی کسطرح سکتا ہے۔ وہ اپنی خود پوش طبیعت اور نمائش و نمود سے گریزپا فطرت کے سبب نہ خود اپنا نام منظرِ عام پر لاتے ہیں نہ دوسروں کو لانے دیتے ہیں۔ انھیں نہ مشاعروں میں پڑھنے کا شوق نہ اخبارات و رسائل میں چھپنے کی ہوس۔ نہ کسی کو شعر سنائیں اور نہ کسی محفل میں خود کو شاعر بتائیں۔ مخصوص محفلوں اور دوستوں کے حلقوں میں گھر جائیں تو اور بات ہے۔ ورنہ ہر جلوت و خلوت میں شعر سنا کر انھیں دوسروں کو بور کرنا نہیں آتا۔ کہتے ہیں "میرے لئے شاعری ذریعۂ عزت و شہرت نہیں وجہ طمانیت و سکون ہے۔ یہ چوراہے کی شعبدہ گری یا عوام کے لئے تماشا نہیں بلکہ میرا ذاتی معاملہ اور محبوب مشغلہ ہے۔ مجھے خیالات کی پیکر سازی اور محسوسات کی لفظی صورت گری سے عشق ہے۔ میں اس عشق میں کھوئے رہنے ہی کو سب کچھ سمجھتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش لگاؤں اور دیکھنے والوں کو ڈھونڈھتا پھروں۔ میں گلستانِ فن کا مالک بھی ہوں اور مالی بھی۔ میں اپنے ذوق کی تسکین اور روح کی تازگی کی خاطر اپنے فکر و خیال کو الفاظ کا پیکر دے کر چھوٹے چھوٹے گلدستے بناتا ہوں اور رباعی کے طاق میں سجا دیتا ہوں۔ یہ گلدستے میری دنیائے خیال کی زینت بھی ہیں قیمت بھی۔ میں انہیں کسی کی خاطر کیوں ارزاں کروں۔ یوسفِ خیال کو مصر کے بازار میں کیوں لے جاؤں" دیکھا آپنے بے نیازی اور استغنا کا عالم۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اقبال شوقی کے نام سے واقف نہ ہو تو چنداں تعجب کی بات نہیں ہے۔ مجھ بھی یہ راز انھوں نے آسانی سے کھلنے نہ دیا۔ کاش اقبال شوقی کو کوئی شخص سمجھائے کہ شاعری محض کتابی چیز نہیں عطیۂ الٰہی بھی ہے اور عطیہ ہونے کی حیثیت سے اس سے لطف اٹھانے کا حق جتنا شاعر کو پہنچتا ہے اتنا ہی دوسروں کو۔ اور میں انکے مزاج کے خلاف آج اپنے اس حق کا استعمال کر رہا ہوں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ اقبال شوقی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو شاعری کو ذریعۂ شہرت و عزت جان کر اُسے خواہ مخواہ اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں شاعر اور شاعری دونوں کا منصب اس سے بلند ہے اتنا بلند کہ کوئی شخص محض لفظی شعبدہ گری کی بدولت وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسکے لئے اعلیٰ انسانی قدروں سے مخلصانہ لگاؤ اور اس لگاؤ کا مخلصانہ فنّی اظہار ازبس ضروری ہو۔ فکر و فن کی اس بلند سطح کا شعور اقبال شوقی کو انکی شرافتِ ذات، زندگی کے گہرے مشاہدے، نفسیاتی ژرف بینی اور وسیع مطالعہ نے عطا کیا ہے۔ اقبال شوقی محض معاشیات کے ایم۔اے نہیں ہیں بلکہ معاشی مسائل سے پیدا شدہ تہذیبی قدروں اور ان کے عروج و زوال کے اسباب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ عہدِ حاضر کی تہذیبی زندگی اور اسکے اثرات کا بہت گہرا شعور ان کے یہاں ملتا ہو۔ لیکن محض وسعتِ مطالعہ یا شعور کی پختگی سو شاعری میں عظمت و رفعت کے آثار پیدا نہیں ہوتے، اسکے لئے غیر معمولی فنّی بصیرت۔ خلاقی قوت اور قادر الکلامی بھی ضروری ہے۔ اقبال شوقی میں یہ اوصاف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ صرف یہی نہیں کہ رباعی کے اوزان اُن کی فنی مہارت کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں بلکہ ان کے کلام سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اردو فارسی کے ممتاز رباعی نگاروں خصوصاً خیام، سرمد، جوش اور فراق کے اسالیبِ سخن کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ مطالعہ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں اور خلاقانہ قوتوں کی مدد سے ایک منفرد اور شیریں و دلکش اسلوب میں ڈھل گیا ہو جسے مختلف اسالیب کے خوشرنگ پھولوں کے عطر کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

بلحاظِ موضوع اقبال شوقی کی رُباعیاں یک رنگی نہیں رنگارنگ ہیں۔ موضوعات کی یہ رنگارنگی صرف نظری مطالعہ یا شعوری کوشش کا مصنوعی نتیجہ نہیں ہو بلکہ اس رنگارنگی میں انکی تنوع پسند طبیعت اور انکے ذاتی مشاہدات و تجربات کو بڑا دخل ہو۔ جن لوگوں نے اقبال شوقی کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان کی شخصیت یک رنگی نہیں رنگارنگ اور ساکت نہیں متحرک ہو۔ وہ "چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا" کے قائل ہیں۔

انھیں زندگی کے بیکراں سمندر کو تختوں سے پاٹنا نہیں آتا۔ وہ زندگی کی اکائی کو ضربی حصّوں میں تقسیم کرنے کی لاحاصل کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ اس اکائی کو اس کے جملہ عیوب و ہنر کے ساتھ دیکھنے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اس کوشش میں انکی لچکدار شخصیت ہر محفل میں ایک نئے رنگ سے نمودار ہوتی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ثقہ میں ثقہ، بے تکلفوں میں بے تکلف، بوڑھوں میں بوڑھا اور جوانوں میں جوان۔ رِندوں میں رِند اور صوفیوں میں ز بن جانا ان کے لئے مشکل نہیں ہے طبیعت کی اس نرمی اور لچک کا یہ اثر ہے کہ وہ زندگی کی رعنائیوں اور کیفیتوں ہی سے نہیں، بلکہ اسکی کج ادائیوں اور بے مہریوں سے بھی لطف و نشاط کے پہلو نکال لیتے ہیں۔ ایک رباعی میں خود کہتے ہیں:-

ہر پھول کی شوخی پہ مچل جاتا ہے
ہر شمع کی گرمی سے پگھل جاتا ہے
یہ حال ہے حسرتِ سکوں میں دل کا
دشمن کی بھی صحبت میں بہل جاتا ہے

اسی خیال کو ایک اور رباعی میں یوں ادا کیا ہے۔

جیسی بھی میسّر ہے پئے جاتے ہیں
ہر لمحہ کو جاوداں کئے جاتے ہیں
جینا نہیں اپنے بس میں شوقی لیکن
جینے کی تمنا میں جئے جاتے ہیں

لیکن اس خیال سے کہ کہیں کوئی سطح بیں ان کے اس بیان سے کسی مغالطہ میں گرفتار نہ ہو جائے انھوں نے دوسری رباعی میں یہ وضاحت بھی کر دی ہے۔

پینے سے مراد محض پینا تو نہیں
مقصودِ نگاہ موجِ مینا تو نہیں
خود جنبشِ لب نہاں ہے ساغر میں مگر
ہر شخص ہماری طرح بینا تو نہیں

غرض کہ اقبال شوقی کی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ فطرت نے زندگی کو کسی ایک گوشے سے نہیں ہر گوشے سے دیکھا ہے۔ کسی ایک پہلو پر نہیں ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور اس وسعتِ نظر کے نشانات انکی رباعیوں میں ہر جگہ صاف نظر آتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے شاعری میں محض یہ بات اہم نہیں ہے کہ شاعر نے زندگی کو کن کن گوشوں سے دیکھا ہے یا اسکے کتنے پہلوؤں کو شعر کا موضوع بنایا ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس نے ان

پہلوؤں کو اپنے فن میں کسطرح برتتا ہے۔ اس فنی برتاؤ کے معیار اور بھی ہیں لیکن اس کا امتحان حقیقتاً اسوقت ہوتا ہے جب ایک شاعر زندگی کے بعض ایسے دقیق و نازک مسئلوں کو چھیڑتا ہو جن کا شائستہ سے شائستہ تذکرہ بھی ثقہ محفلوں کے لئے سوءِ ادب خیال کیا جا سکتا ہے۔ بطورِ مثال حیاتیات کے بعض ایسے مسائل کو لیجئے جن کا تعلق جنسی کوائف سے ہے آپ جانتے ہیں کہ ادب اور زندگی دونوں میں ان کی اہمیت معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔ لیکن ان کوائف کی ایسی پاکیزہ ترجمانی کہ اس سے ایک طرف نفسیاتِ انسانی کی بعض پوشیدہ گرہیں بھی کھل جائیں۔ دوسری طرف قاری کو اہتزازِ روح اور انبساطِ قلب کا سامان بھی میسّر آجائے۔ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اقبال شوقی کے یہاں مجھے فنی برتاؤ کا یہ جادو اکثر جگہ نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کے کثیف و کثیف اور نازک سے نازک پہلوؤں کو ہاتھ لگاتے ہیں لیکن اس التزام اور حسنِ احتیاط کے ساتھ کہ ان کا اسلوب سرتاپا لطافت میں ڈوب جاتا ہے چند رباعیاں دیکھئے۔

جب گیسوئے شب رنگ بکھر جاتے ہیں
ہے طرفہ ستم یہ کہ سنور جاتے ہیں
کھلاتے ہیں جس قدر تری سیج کے پھول
رخسار اُسی قدر نکھر جاتے ہیں

سینے کے گداز سے دمک جائے بدن
انفاس کے ساز سے کھنک جائے بدن
پھولوں کی طرح شگفتہ اک پیکرِ ناز
آغوش میں آئے تو لچک جائے بدن

تنہا ہوں تو بن سنور کے اٹھلا کے چلیں
ہوں ساتھ اگر لجا کے بل کھا کے چلیں
جی میں یہ ترنگ چہلیں کرتے چلیئے
چلنے میں یہ بانکپن کہ کترا کے چلیں

ان رباعیوں میں زبان و بیان کے جادو سے قطع نظر جو کہ محاکاتِ شاعرانہ کے نام سے غیر مرئی اشیاء کو ایک جاندار مجسمہ کی صورت میں لا کھڑا کرتا ہے۔ دیکھنے کی چیز دراصل یہ ہو کہ شاعر نے ان میں حیاتِ انسانی کے جن نازک اور مشکل مسئلوں کو چھیڑا ہے ان سے کسطرح پاکبازی اور آسانی سے کامیاب گذر گیا ہے۔ ہر چند کہ ان رباعیات کا تعلق انسان کے فطری میلانات سے ہے جن کے ذکر میں معمولی سی لغزش بھی نفس کی بے چینی اور جسم کے ھیجان کا سبب بن سکتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ اسکے برعکس ہے۔ شاعر نے ان میلانات کو

جمالیاتی اقدار کی ایسی بلند سطح سے ہمکنار کردیا ہے کہ وہ ہمارے نشاطِ روح اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ اقبال شوقی نے ان رباعیات میں فطرتِ انسانی اور نفسیاتِ نسوانی کے جن پہلوؤں کا ذکر کیا ہے وہ اچھوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ہمارے غزل گو شعراء نے معاملاتِ حُسن و عشق کے تحت ان پہلوؤں کو اکثر چھیڑا ہے۔ لیکن ان کے فنی اظہار میں کامیابی سب کو نہیں کسی کسی کو ہوئی ہے۔ جہاں تک رباعی کا تعلق ہے فراق گورکھپوری اور اقبال شوقی کے سوا یہ جمالیاتی اسلوب کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتا۔ فراق کے جمالیاتی اسلوب کا ذکر آگیا ہے تو اقبال شوقی کی چند رباعیاں اور دیکھتے چلئے۔

قرطاسِ گل و لالہ پہ یہ نقش و نگار
یہ جلوۂ رنگ و بو یہ اعجازِ بہار
موجوں کی سُبک روی میں نغموں کا سرور
فطرت بھی ہے کتنی سادہ کتنی پُرکار

اُمڈے ہوئے سیلاب کے پانی کا خیال
بپھری ہوئی موجوں کی روانی کا خیال
جیسے دمِ صبح ٹوٹتا سا نشہ
اس طرح سے آتا ہے جوانی کا خیال

مدھم سے سروں میں گا رہا ہو جیسے
زیرِ لب مُسکرا رہا ہو جیسے
یوں تیز ہوئی جاتی ہے دل کی دھڑکن
کوئی مرے پاس آرہا ہو جیسے

سورج کی کرن اُبھر رہی ہو جیسے
دھندلی سی فضا نکھر رہی ہو جیسے
اسطرح سے یاد آرہا ہے کوئی
شیشے میں پری اُتر رہی ہو جیسے

نظروں میں ہے ساری زندگانی ساقی
آئینہ بنی ہے عُمرِ فانی ساقی
جیسے گرمی سے پھول کُمھلا جائے
کُمھلا گئی اسطرح جوانی ساقی

ہر عشوہ ہے نازِ کج ادائی کی ترنگ
ہر غمزہ ہے خوئے دلربائی کی ترنگ
آئینہ بھی ہے موردِ الزام مگر
عالم ہے ادائے خودنمائی کی ترنگ

آنکھوں میں ہے تابانی سیمائے جمال — دل میں ہو سرورِ موجِ مینائے جمال
یوں بزمِ تصور میں ہو کوئی جیسے — دامن میں ہو گلدستۂ رعنائے جمال

پیمانہ بکف جانِ بہار آئے تو — محفل میں وہ شوخِ فتنہ کار آئے تو
میخوار تو خود بخود بہک جائیں گے — ساقی کی نگاہوں میں خمار آئے تو

پیمانہ خمارِ چشمِ ساقی بھی تو ہے — میخانہ عیارِ چشمِ ساقی بھی تو ہے
مستوں کی بڑی بات ہے، اللہ اللہ — مستوں میں شمارِ چشمِ ساقی بھی تو ہے

یہ اور اس رنگ کی دوسری رباعیاں ہماری جمالیاتی حس کو جس انداز سے چھیڑتی ہیں وہ فراق کے انداز سے بہت ملتا جلتا ہے۔ فراق کی طرح اقبال شوقی بھی اپنے جمال پرستانہ خیالات کی تصویر کشی میں محبوبہ کے اعضائے جسمانی اور اسکی حرکات و سکنات سے مدد لیتے ہیں۔ لیکن اس ہم رنگی کو تقلید سے تعبیر کرنا غلطی ہوگی۔ دو چیزیں شوقی کی رباعیوں کو فراق سے یکسر الگ کردیتی ہیں۔ ایک زبان و بیان کی پاکیزگی و لطافت۔ دوسرے وہ تاثر جو اُن کی رباعیات کے مطالعہ کے بعد ذہن پر مرتب ہوتا ہے۔ جس نے فراق کی رباعیوں کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہو وہ اس امر کی شہادت دیگا کہ ان کی زبان قدیم ہندو تہذیب اور ہندی و سنسکرت الفاظ کو شعوری طور پر اپنانے کے سبب اکثر جگہ بوجھل، غیر مانوس اور مصنوعی ہوگئی ہے۔ نتیجتاً ان کی ندرت خیال اور تازگیِ احساس کا اثر بہت کچھ زائل ہوگیا ہے۔ اسکے برعکس اقبال شوقی کی زبان چونکہ اپنے فطری اور کلاسکی لہجہ سے ہر جگہ ہم آہنگ ہے، اس لئے بیانِ حسن کے سلسلے میں ان کا حسنِ بیان ہر جگہ پُرکشش بن گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ فراق کی رباعیوں کا تاثر ہماری جمالیاتی حسوں کو گدگداتا تو ہے لیکن کچھ اسطرح کہ اسکی رسائی عموماً جنسی سطح سے آگے نہیں بڑھتی اسکے برعکس اقبال شوقی کی رباعیوں کا تاثر ان کے مفکرانہ مزاج اور متصوفانہ طبیعت کے زیرِ اثر حسی سطح سے بلند ہوکر زندگی کی اعلیٰ قدروں اور بلند مقاصد سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ بطورِ مثال مندرجۂ ذیل رباعیاں دیکھیے

تمہیدِ کتابِ زندگانی کے لئے — دیباچۂ منظومِ جوانی کے لئے
الفاظ میں دل کی بات ادا ہو نہ سکی — اصنام تراشے ترجمانی کے لئے

آرائشِ زلفِ شادمانی کے لئے — زیبائشِ حسنِ جاودانی کے لئے
سینچی ہے جگر کے خون سے کشتِ مراد — شادابیٔ نخلِ زندگانی کے لئے

اِک لمحۂ ناز کامرانی کے لئے — اِک ساعتِ کیفِ شادمانی کے لئے
چُن لی ہیں چمن سے نو دمیدہ کلیاں — تزیینِ عروسِ زندگانی کے لئے

کچھ نقشِ تسلسلِ زمانی کے لئے — کچھ عکسِ تغیّرِ مکانی کے لئے
ہم نے مہ و مہر پر کمندیں ڈالیں — مشاطگیٔ حسنِ معانی کے لئے

آپ اِن رباعیوں کو جو معنی چاہیں پہنائیں۔ میرے نقطۂ نظر سے ان کا اساسی تعلق میلانِ جنسی ہی سے ہے۔ لیکن آپ اتنی بات تو محسوس کر رہے ہوں گے کہ ان رباعیوں میں اس جنسی خیال کی غایت بلحاظِ اثر پذیری تلذذ یا ہیجان نہیں۔ بلکہ ذہن کو زندگی کی اعلیٰ قدروں اور پاکیزہ اُمنگوں سے ہم آہنگ کرنا ہے اور یہی ہم آہنگی دراصل اقبال شوقی کی جمال پرستی کو فراق کی جمال پرستی سے الگ کر دیتی ہے۔

اقبال شوقی کی رباعیات کا لہجہ کہیں کہیں جوش کے لہجہ سے بھی ہم رنگ نظر آتا ہے۔ یہ ہم رنگی رندانہ مضامین کے بیان میں خصوصیت سے اُبھر آتی ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ جوش اور شوقی فارسی کا بہت گہرا اور پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ زندگی کے سارے رِجائی پہلوؤں سے زندگی کا رس نچوڑ لینے کے متمنی ہونے کے سبب دونوں خیام اور حافظ کے غنائی لہجے سے بہت متأثر ہیں۔ فرق یہ ہو کہ جوش آتشِ سیّال میں ڈوبے رہنے اور آگ کو پانی کر کے پی جانے کے سبب حافظ و خیام کی شاعری کے صرف اس پہلو سے فائدہ اُٹھایا ہے جس کا تعلق "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مسلک سے ہے لیکن اقبال شوقی اصغر گونڈوی کی طرح حافظ و خیام کے ان پہلوؤں سے بھی متأثر ہوئے ہیں جن میں اسرارِ کائنات و رموزِ حیات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

شوقی کی چند رباعیاں دیکھئے:

اک عمر کے بعد رُو براہ آیا ہوں — ساقی کے حضور عذر خواہ آیا ہوں
نظروں میں ہیں زندگی کی مُثبت قدریں — سینے میں لئے ذوقِ گناہ آیا ہوں

اِک نغمۂ بے صوت و صدا رکھتا ہوں — اِک قلبِ سرور آشنا رکھتا ہوں
شائستگیٔ غم سے ہوئی دل کی نمو — انجامِ وفا کا حوصلہ رکھتا ہوں

اُف گردشِ ایام کہ شب جاتی ہے — گردش میں رہے جام کہ شب جاتی ہے
ساقی تجھے اندیشۂ فردا کی قسم — لا بادۂ گلفام کہ شب جاتی ہے

یوں مُفت میں جینے کا نہ الزام اُٹھا — اُٹھ اور ہر اک پردۂ اوہام اُٹھا
ہے حاصلِ زندگی سرور و مستی — پی اور پلا جام اُٹھا جام اُٹھا

ہستی مری مَیگسارِ مینائے جمال — مستی مری مستعارِ مینائے جمال
کل حُسن کی کائنات قبضے میں مرے — میں بندۂ حق گذارِ مینائے جمال

کیا دامنِ تار تار میں ہے ساقی — اِک طرفہ ستم بہار میں ہے ساقی
سب باتوں میں صرف دل کو لگتی ہے یہ بات — سب کچھ ترے اختیار میں ہے ساقی

خود نفس سے اپنے ڈر رہے ہیں ساقی — ڈر ڈر کے گناہ کر رہے ہیں ساقی
کسطرح گذر رہی ہے کیا تجھ سے کہیں — پیمانۂ عمر بھر رہے ہیں ساقی

محفل کا تری شعار کیا ہے ساقی — میزان ہے کیا عیار کیا ہے ساقی
آداب و قوانین کے پابند ہوں مست — یہ جبر یہ اختیار کیا ہے ساقی

جب طبعِ حزیں اِذنِ بیاں پاتی ہے　　کیفیتِ غم شعر میں ڈھل جاتی ہے
ہر لفظ میں میرا دل دھڑکتا ہے مگر　　آواز کہیں دُور ہی سے آتی ہے

آنکھوں میں خمارِ خواب جھلکے جیسے　　پیراہن سے شباب جھلکے جیسے
ہر شعر میں جلوہ گر عروسِ معنےٰ　　شیشے سے شرابِ ناب جھلکے جیسے

اک آہِ جگر سوز لئے پھرتا ہوں　　اک نالۂ دل دوز لئے پھرتا ہوں
دل مجھ کو شب و روز لئے پھرتا ہے　　میں دل کو شب و روز لئے پھرتا ہوں

اے پختگیٔ ذوق یہ خامی کیسی　　یہ پیروئ عارف و عامی کیسی
مرکز سے محیط تک پہونچنے تو دے　　اے عمرِ رواں یہ تیز گامی کیسی

کچھ دہر سے بے رخی بھی کر کے دیکھیں　　کچھ عقل سے سرکشی بھی کر کے دیکھیں
کیوں لوگ آخر اسے برا کہتے ہیں　　کچھ نفس سے دوستی بھی کر کے دیکھیں

پھولوں کے تبسّم سے گلستاں روشن　　تاروں کی ضیا سے چرخِ گرداں روشن
معراجِ خود آگہی ہے عرفانِ اَنا　　عرفانِ اَنا سے دلِ یزداں روشن

بھولے سے رَوا کو نارَوا کہہ سکتے　　دانستہ سزا کو ناسزا کہہ سکتے
کیوں شیوۂ بندہ پروری عام ہوا　　حسرت ہے کسی بت کو خدا کہہ سکتے

ان رباعیوں کا لہجہ فارسی میں خیامؔ اور اردو میں جوشؔ سے بہت ملتا جلتا ہے ۔

یہاں یہ بات بھی واضح کرتا چلوں کہ ادبی تنقید میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ فراقؔ کی غزلوں کا رنگ مولانا حسرتؔ سے، حسرتؔ کی غزلوں کا رنگ داغؔ سے، داغؔ کا مومنؔ سے، مومنؔ کا مصحفیؔ سے، اور مصحفیؔ کا میرؔ اور دردؔ سے متأثر نظر آتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کے

مقلد ہیں یا اس ہم رنگی سے ان کی انفرادیت مجروح ہوتی ہے۔ ہم رنگی کے باوصف ایک خلّاق شاعر اپنا رنگ الگ پیدا کرلیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح خلّاقِ ازل کی مخلوقات میں ایک ہی جنس کی تمام اشیاء اپنی ظاہری یک رنگی کے باوجود اپنی اندرونی خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ مثال کے طور پر انسان ہی کو لیجیے سارے افراد اپنی ظاہری ساخت کے لحاظ سے ایک سے ہیں لیکن اپنے مزاج کے اعتبار سے دو حقیقی بھائی بھی ایک سے نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں ایک خلّاق شاعر کسی دوسرے شاعر کے بعض پہلوؤں کے ہم رنگ ہو کر بھی اس کا مقلد کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ دنیا کے سارے معتبر نقادوں نے شاعر کے لئے اپنے پیش رو شعراء کے مطالعہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ ابن رشیق اور مولانا حالی نے تو یہ شرط لگائی ہے کہ ایک اچھے شاعر کو مختلف اساتذہ کے کم از کم پانچ ہزار اشعار یاد ہونے چاہئیں۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن کے سارے دریچے کھل جاتے ہیں۔ اسکے تنقیدی اور تخلیقی شعور کی تربیت ہوتی ہے اور وہ اپنے پیش رو کی لاشعوری تقلید سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ فراق اور جوش یا خیام سے اقبال حسین شوقی کی ہم رنگی کی بھی یہی صورت ہے۔ انھوں نے اپنے پیش رو اور معاصر شعراء کی رباعیوں کا خاطر خواہ مطالعہ کیا ہے اور ان کے اسالیب سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ اس تاثر کی جھلک اُنکی رباعیوں میں نظر بھی آتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی اقبال شوقی کا رنگ اُردو کے دوسرے رباعی نگاروں سے بہت الگ ہے۔ اتنا الگ کہ رباعی نگاروں کی بھری محفل میں آپ انھیں بہ آسانی پہچان سکتے ہیں۔

اقبال شوقی کے جس رندانہ اور جمال پرستانہ لب و لہجہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر ان کے اسلوب کے عناصرِ ترکیبی میں ایک اور چیز قابلِ توجہ ہے۔ میری مراد اُن کے متفکرانہ لہجے سے ہے یہ متفکرانہ لہجہ ان کی ساری شاعری پر حاوی ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کی سنجیدہ اور تفکر پسند طبیعت کسی مشاہدہ یا تجربے سے محض جذباتی تأثر قبول کرنے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اُسے فکر کے میزان پر بار بار تولتی ہے۔ اور غور و فکر کے

ذریعہ اُسکی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی کوشش شاعرانہ دلکش اسلوب میں ڈھل کر ایک طرف قاری کے لطف و انبساط کا سبب بنتی ہے۔ دوسری طرف اسے زندگی کے مسائل و حقائق پر ناقدانہ اور فلسفیانہ نگاہ ڈالنے کی دعوت دیتی ہے۔ چند رباعیاں دیکھئے :-

جو کچھ کہ تصوّر میں عیاں ہوتا ہے　　وہ عالمِ ہستی میں کہاں ہوتا ہے
ہر نقش نظر آتا ہے دُھندلا دُھندلا　　ہر چیز پہ سائے کا گماں ہوتا ہے

مسکن ہے کہ کاشانہ ہے معلوم تو ہو؟　　بستی ہے کہ ویرانہ ہے معلوم تو ہو؟
صورت تو کوئی اُبھر کے آئے کہ یہ دل　　کعبہ ہے کہ بتخانہ ہے معلوم تو ہو؟

اظہارِ حدیثِ دلبرانہ بھی قفس　　اندازِ نگاہِ محرمانہ بھی قفس
بیچارگیٔ خونِ تمنا کی قسم　　گلشن بھی قفس ہے آشیانہ بھی قفس

میرے لئے اِک دردِ جگر کافی ہے　　تیرے لئے اِک دیدۂ تر کافی ہے
تحسینِ سخن کا مسئلہ نازک ہے　　خاموشیٔ اربابِ ہنر کافی ہے

نغمہ کوئی صورِ نفس سے ابھرے تو؟　　شعلہ کوئی طُورِ نفس سے اُبھرے تو؟
ہر لفظ سے الہام کے سوتے پھوٹیں　　کچھ سطحِ شعورِ نفس سے ابھرے تو؟

یا ذوقِ شعورِ نفس بیدار کروں　　یا اپنے وجود سے بھی انکار کروں
ہستی مری مبنی ترے اثبات پہ ہے　　فطرت کا تقاضا ہے کہ اقرار کروں

وابستہ بہ غمِ چمن میں رہتے تنہا　　آمادہ بہ رمِ وطن میں رہتے تنہا
فانوسِ خیال اگر نہ روشن کرتے　　ہم بھی بھری انجمن میں رہتے تنہا

پندارِ انا بڑھا ہوا ہے ساقی　　ہر شخص خدا بنا ہوا ہے ساقی
بربادی پر تلی ہوئی ہے دنیا　　جانے دنیا کو کیا ہوا ہے ساقی

اِک ہاتھ کی محتاج ہے شمشیر بھی تو ‏ ‏ ‏ حلقوں میں گھری ہوئی ہے زنجیر بھی تو
اسباب کے واسطے مُسبّب لازم ‏ ‏ ‏ وابستۂ تدبیر ہے تقدیر بھی تو

پندار کے نشہ سے سنبھلنا مشکل ‏ ‏ ‏ افتادِ طبیعت کا بدلنا مُشکل
الحاد کے حلقہ سے نکلنا آساں ‏ ‏ ‏ تقلید کے پھندے سے نکلنا مشکل

گُل ہنستے ہیں اور گلستاں ہنستے ہیں ‏ ‏ ‏ مہرومہ و انجم و کہکشاں ہنستے ہیں
ہے شیوۂ تسلیم و رضا خوب مگر ‏ ‏ ‏ مجھ پر مرے سجدوں کے نشاں ہنستے ہیں

اک ذرّہ بے بود بھی بے بود نہیں ‏ ‏ ‏ اِک قطرۂ محدود بھی محدود نہیں
نسبت ہو اگر کُل سے تو ہر جزو بھی کُل ‏ ‏ ‏ ورنہ کوئی موجود بھی موجود نہیں

بے مایۂ غرورِ کامرانی تنہا ‏ ‏ ‏ بے لطفِ نشاطِ شادمانی تنہا
بے فرصتِ غم ہر ایک ساعت بیکار ‏ ‏ ‏ بے لذتِ درد، زندگانی تنہا۔

یہ رباعیاں تأثر یا ارتعاش کے جذبہ سے عاری نہیں ہیں۔ ان میں جذبات کی ھلکی پھلکی لہریں معنی کی تہہ میں اپنا کام کر رہی ہیں۔ لیکن آپ یہ بھی محسوس کر رہے ہوں گے کہ ان پر بہ حیثیتِ مجموعی جذبہ کا نہیں بلکہ فکر کا غلبہ ھے۔ یعنی ان رباعیوں کا لب ولہجہ جذباتی نہیں مفکّرانہ ہے۔ اس مفکّرانہ لب و لہجے نے جہاں اقبال شوؔقی کی رباعیوں کو معنوی تہہ داری اور گہرائی عطا کی ہے وہاں ان میں ایک طرح کی روشنی اور حرارت بھی بخشی ہے۔ ایسی روشنی و حرارت جو کبھی دلوں کو گرماتی ہے کبھی روح کو تڑپاتی ہے اور کبھی ذہنِ انسانی کے لیے نئے افق پیدا کر کے اسے مسائلِ حیات پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔ فکر کی یہ رسائی اور غور و فکر کی یہ دعوت زندگی کے کسی مخصوص شعبے تک محدود نہیں ہے بلکہ مذہب وسائنس، تہذیب و معاشرت، فلسفہ وادب، اور سیاست و معیشت سب اس کے حلقۂ اثر میں آگئے ہیں۔ میں طوالت کے خوف سے اقبال شوؔقی کے مفکّرانہ لہجے کی معنی آفرینی اور

اثرپذیری کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا بلکہ صرف ایک دو مثالوں کے ذریعہ اپنے دعوے کی وضاحت کروں گا
حسب ذیل رباعیاں دیکھئے :-

غنچہ کہ شمیمِ جانفزا کو ترسے   تارا کہ شعاعِ پُرضیا کو ترسے
مفہوم کہ تشنہ لبِ گویا کے لیے   لب تشنہ کہ حرفِ مدعا کو ترسے

نرگس کہ نگاہِ سرمہ سا کو ترسے   سوسن کہ کفِ گل آشنا کو ترسے
اِک کنج کہ بلبل کے لئے چشم براہ   اِک خار کہ آبلہ بہ پا کو ترسے

اِک شاعرِ خوش نوا نوا کو ترسے   اِک مطربِ خوش لحن صدا کو ترسے
اِک ساز کہ بیتاب ہو نغموں کے لئے   اِک زخمہ، سرودِ دلربا کو ترسے

اِک قالبِ مرمریں نظر کو ترسے   اِک چشمِ صدف، آبِ گہر کو ترسے
اِک غمزہ کہ مقدور نہ جانے اپنا   اِک عشوہ کہ شرحِ معتبر کو ترسے

اِک ہوش رُبا آئینہ گر کو ترسے   اِک آئینہ گرُ نورِ بصر کو ترسے
اِک ماہ جبیں کو چاہِ نخشب کی تلاش   اِک زہرۂ خود پرست، بَر کو ترسے

اِک سالکِ راہِ حسنِ ظن کو ترسے   اِک حاملِ رازِ انجمن کو ترسے
خود اہلِ وطن بات نہ سمجھیں شوقی   اِک صاحبِ ادراکِ سخن کو ترسے

یہ رباعیاں اگرچہ الگ الگ بھی اپنے معنی دیتی ہیں لیکن اگر آپ غور کریں تو وحدتِ اثر کے لحاظ سے ایک مکمل نظم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس نظم کا عنوان آپ "تشنگی" تجویز کر سکتے ہیں لیکن یہاں تشنگی سے مراد کچھ اور چیز ہے۔ یہ دراصل علامت ہے زندگی کی اس تنگ و تاریک فضا کی جس میں انسان جبرِ مشیت کے تحت بہر حال جی رہا ہے۔ یہ تشنگی استعارہ ہے اس سیاسی و معاشی گھٹن کا جسے آج ہر طبقہ میں شدت سے

محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظم لڑکوں کا کھیل نہیں قطرۂ دجلہ نما ہے۔ اس میں شاعر نے ہماری روحِ عصر کے کربِ دقیق کو حسنِ اختصار و ایجاز اور حسنِ فنکاری و حسنِ خبری کے ساتھ سمیٹ لیا ہے وہ اسکی شاعرانہ بزرگی پر دلالت کرتی ہے۔ ہر چند یہ رباعیاں ماحول سے ایک خاص قسم کی بغاوت اور سماجی و سیاسی بصیرت ہی کا پتہ دیتی ہیں۔ لیکن ان کا لب و لہجہ اور ان کی اثر پذیری سیاسی سماجی نہیں، ادبی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال شوقی اس نکتے سے خوب واقف ہیں کہ موضوع و مقصد کو شعر کی سطح پر نہیں شعر کی تہہ میں بہنا چاہئیے۔ ان کے اس مفکرانہ لہجے کو سمجھنے کے لئے چند رباعیاں اور دیکھئے:-

یہ جاہ، یہ منصب، یہ امارت کیا ہے؟ | یہ بھوک، یہ افلاس، یہ نکبت کیا ہے؟
انسان انسان سب برابر ہیں، مگر | یہ حُسنِ کرشمۂ مشیت کیا ہے؟

ہے جبر کہ اختیارِ فطرت کیا ہے؟ | اس خاک کے پُتلے کی جبلّت کیا ہے؟
انسان فرشتہ بھی ہے انسان بھی ہے | یہ حُسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے؟

مفہومِ مساوات و اُخوّت کیا ہے؟ | سر رشتۂ امتیازِ وحدت کیا ہے؟
معروف کے معنی نہ سمجھ میں آئیں | یہ حُسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے؟

یہ پیچ و خمِ گیسوئے فطرت کیا ہے؟ | اس پردگیٔ راز میں حکمت کیا ہے؟
انسان ہو مبتلائے صد ظن و گماں | یہ حُسنِ کرشمۂ مشیت کیا ہے؟

سرمایۂ نازِ عیش و عشرت کیا ہے؟ | اِک آذرِ بُت ساز ہو دولت کیا ہے؟
کیوں زر سے تمام عیب چھپ جاتے ہیں! | یہ حُسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے؟

آئینِ سعادت و نحوست کیا ہے؟ | معیارِ شرافت و ذلالت کیا ہے؟
کچھ علم عطا ہو صاحبِ لوح و قلم! | یہ حسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے؟

ان رباعیوں کا چوتھا مصرعہ ع "یہ حُسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے؟"
کتنا دلآویز اور کتنا خوب صورت ہے۔ لیکن اس دلآویزی اور خوبصورتی کے پردے میں طنزِ لطیف کے آبدار نشتر چُبھے ہوئے ہیں۔ شاعر نے اِن رباعیوں میں علامہ اقبال کے "شکوہ" کے طرز پر نظامِ فطرت اور عدالتِ ازلی کو نہایت شائستہ، مؤدّبانہ اور معصومانہ انداز سے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ رباعیاں بھی ایک ہی رشتۂ خیال میں پروئی ہوئی ہیں اور فکر و شعور سے لبریز نظم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اس کا عنوان "سوالیہ نشان" تجویز کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ سوالیہ نشان بھی نمائندہ ہوگا اس ذہنی اُلجھن، تذبذب، بے یقینی، انتشار، تجسّس، ناآسودگی، بے اطمینانی اور اُس درماندگی کا جس سے آج ساری دنیا عموماً اور ہمارا معاشرہ خصوصاً دوچار ہے، یہ سوالیہ نشان دراصل استعارہ ہوگا، مذہب و سائنس کے اس ٹکراؤ اور قدیم و جدید کے اس تصادم کا جس نے زندگی کی نئی اور پرانی قدروں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کر رکھا ہے۔ یہ سوالات جو اوپر کی رباعیوں میں کئے گئے ہیں نئے نہیں ہیں۔ بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی ترقی کے سبب ہماری تہذیبی قدریں جسطرح ایک ایک کرکے دم توڑ رہی ہیں اور زندگی کی ابدی قدروں سے جس تیزی کے ساتھ ہمارا ایمان اُٹھتا جا رہا ہے اس نے ہر متمدن اور باشعور شہری کو اس انداز سے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سوالات ہماری آپ کی دلچسپی اور کشش کا سبب نہ بنتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اِن سوالات کو جس شائستگی اور جس حسن کاری و صنّاعی کے ساتھ اقبال شوقی نے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے اور اپنے مفکّرانہ لہجے سے جس قدر فکر انگیز بنا دیا ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ احساس کو فکر سے ہم آہنگ کرنے اور فکر کو احساس میں سمو دینے کی روش اقبال شوقی کے یہاں عام ہے۔

اقبال شوقی کا یہ مفکّرانہ لب و لہجہ جس کا اجمالی تذکرہ میں نے اوپر کیا ہے، ان کی شاعری

کا اساسی لب ولہجہ ہے۔ وہ جمالیات ونفسیات کو شعر کا موضوع بنائیں یا تصوّف و فلسفہ کو مذہبی اور اخلاقی اقدار کو زیرِ بحث لائیں، یا سیاسی وسماجی مسائل کو تخیّل کی رنگینی اور احساس کی لطافت پر فکر کی دھوپ چھاؤں بہرحال قائم رہتی ہے۔ اس فکری لہجے کا جو پہلو خاص طور پر خوش آیند اور قابلِ توجہ ہے اور جس کے سبب اس میں غیر معمولی دلکشی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں در اصل اس لہجے کی رجائیت ہے، چند رباعیاں دیکھئے:۔

یہ بے خبری وجہ خبر بھی تو ہے
اس آتشِ خفتہ میں شرر بھی تو ہے
راتوں کے اندھیروں سے گذر کر دیکھو
ہر رات کے پردے میں سحر بھی تو ہے

ہر چند کہ زیست مختصر ہوتی ہے
ہر چند کہ بے قصد بسر ہوتی ہے
لیکن اس بات سے سکوں ملتا ہے
ہر رات کے دامن میں سحر ہوتی ہے

گرداب کی گود میں جو رہ سکتے ہیں
موجوں کے تھپیڑے بھی وہ سہہ سکتے ہیں
ہے وقت کے دریا کو پکڑنا تو محال
ہاں اسکے ساتھ ساتھ بہہ سکتے ہیں

یہ بھی تو ہے عاشقی کا اک رُخ یارو
یہ بھی تو ہے بیخودی کا اک رُخ یارو
بیگانۂ مقصودِ طلب ہو جاؤں
یہ بھی تو ہے زندگی کا اک رُخ یارو

بے شائبۂ رَم بُتِ کافر بہتر
بے کشمکشِ غمِ مے و ساغر بہتر
تاچند یہ ناکردہ گناہوں کا شمار
افسردہ دلی سے دامنِ تر بہتر

آفاق کی رُوکشی بڑھا دیتے ہیں
احساس کی سرخوشی بڑھا دیتے ہیں
حد درجہ ہیں دلفریب خوابوں کے طلسم
انسان کی زندگی بڑھا دیتے ہیں

یہ رجائیت اقبال شوقی کی شخصیت و مزاج کی نمایندۂ خاص ہے چنانچہ ان کے رجائی نقطۂ نظر ہی کا فیضان ہے کہ وہ زندگی کی ہر ظلمت سے ایک طرح کی روشنی، ہر غم سے ایک طرح کی سرخوشی، ہر ستم سے ایک طرح کا لطف اور ہر قاہری سے ایک طرح کی دلبری کے پہلو تراش لیتے ہیں - مجھے یقین ہے کہ ہماری آپ کی طرح ان کی زندگی بھی ایک بار نہیں ہزار بار مایوسی اور شکست کے نرغے میں آئی ہوگی لیکن انکی رجائی فطرت نے ان کی شاعری کو کہیں ایک جگہ بھی شکست و مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا - ان کی یہی ناقابلِ شکست رجائی طبیعت جہاں ان سے اپنے متعلق یہ کہلواتی ہے کہ

کھلتا نہیں کوئی راز بے دل چیرے　　　اے دوست کھلے گا بھید دھیرے دھیرے
یہ جن کو رباعیاں سمجھتا ہے جہاں　　　انمول رتن ہیں بیش قیمت ہیرے

وہاں مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان کی رباعیوں میں زخمِ دل کی نمائش ہی نہیں بلکہ زخمِ دل کا مرہم بھی ہے -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حمد و ثنا

تو منبعِ حسن تو خداوندِ جہاں
تو لائقِ حمد تو نیّرِ اوّلیں
تجھ سے نہ طلب کروں تو کس سے مانگوں؟
مرجعِ ہر اک امید کا تو ہی تو ہے

ہر صبح تری حمد و ثنا کرتا ہوں
ہر شام تجھی سے التجا کرتا ہوں
بے منتِ ماسوا عطا ہو یارب
ہر سانس کے ساتھ یہ دعا کرتا ہوں

اظہارِ خیال کس سے تشنہ رسائی ہے
عرضِ احوال کس سے تشنہ رسائی ہے
اے صاحبِ اقتدار اے ربِّ خبیر
بندوں سے سوال کس سے تشنہ رسائی ہے

کب وصف احاطۂ بیاں میں آیا
با حمد و ثنا سے ہیچ برتر آیا

خود میرا وجود تیری ہستی کی دلیل
بے مہر کہاں کی دھوپ یہ کیسا سایا؟

اس دامنِ تار تار سے کیا جاں میں؟
اس روح کے انتشار سے کیا جاں میں؟
آسائشِ زیست بھی عطا کی ہوتی
اس نعمتِ جاں زار سے کیا جاں میں؟

غمزہ تیرا ہے یہ کیا ہے کسی تیغ تیز ہو

اے حسن مجھ سے اور کوئی نہ تیرا تو ہو

بے جوان و جسد ہے اے تیری بستی کا لقیں

بیکس کوئی ہے بس کوئی تصویر تو ہو

اے وہ کہ خرد کی آگہی سے بالا
اظہار نیاز و بندگی سے بالا
اثبات دلائل و براہین کی قسم
ہستی تری اقرار دلیل سے بالا

صَلُّوا عَلَیہِ وَاٰلِہٖ

نعت و منقبت

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اے باعثِ افتخارِ دارین! سلام

اے صدر نشینِ بزمِ کونین! سلام

اے واقفِ سرِّ قابِ قوسین! درود

اے ابنِ حسنِ لیلیٰ، جدِّ حسنینؑ! سلام

وہ ماہ مبین و جوہر جملہ صفات
وہ نور جہاں تاب وہ آئینۂ ذات

شوقی بہ ہزار عجز سے شوق اس پہ درود
شوقی بہ ہزار جان و دل اس پہ صلوات

وہ محفلِ انبساط، وہ بزمِ سرور
بارشِ حسنِ نگارزار ابر کی شبِ دیجور

اک کیف ہے سرمدی فضا پہ طاری
وہ ارضِ مقدس ہے بہشتِ پُرنور

روتے ہوئے رحمت کے طلبگار رہیے
چلنا نہیں چاہئے تھے ناچار رہیے

ہر گام پہ دل تڑپ کے اٹھتا ہے
دل کو تھامے ہوئے دل افگار رہیے

اس باغِ جناں میں خوشبو سی چھوڑ آئے

اس پیڑ جیسے میں ہم بتیں چھوڑ آئے

اس بار شوقی

سو بار وہاں بلائے جب آئے

اک شخص ہم اپنا دل وہیں چھوڑ آئے

سرچشمۂ تسلیم و رضا ہیں یہ بزرگ
سرخیل گروہ اصفیا ہیں یہ بزرگ
ہے رشک فرشتوں کو بھی اُن تقویٰ
محبوب جناب کبریا ہیں یہ بزرگ

یہ تکمیلِ دعائے احمدِ مرسل ہیں
منشائے خدائے احمدِ مرسل ہیں

وہ عدل کے پیکر وہ سراپا ایثار
فاروقؓ ادائے احمدِ مرسل ہیں

عثمانؓ وہ مستِ بادۂ حلم و حیا
عثمانؓ وہ منبعِ صد احسان و عطا
منجملۂ عشرۂ مبشّر عثمانؓ
عثمانؓ وہ جاں دادۂ منشورِ وفا

منجمله ارباب سیادت بین علی ع
سرآمد جماعت ارادت بین علی ع
گنجینه اسرار علوم و ادبی
پرورده آغوش رسالت بین علی ع

یا سیّدہ یا بنتِ نبیؐ التحیات
یا قرّۃ عینِ سیدیؐ التحیات

از مہرِ حسنؓ و حسینؓ آداب و نیاز
یا سیّدہ با علیؓ التحیات

وہ جس کا دلوں میں مسکن آنکھوں میں مقام
وہ کوہِ وقار، وہ عزیمت کا امام

مدح اس کی ہے زبان و بیاں سے بالا
وہ پیکرِ تمکیں کہ حسنؓ جس کا نام

دل خُون ہے انگلیاں فگار ہاتھ میں قلم
کیسے کریں یہ روداد شہادت کی رقم
کھاتے ہیں حسینؓ کی شہادت کی قسم
قائم ہے حسینؓ سے شہادت کا بھرم

غیب و شهود

خلوت سے ہوا عالمِ جلوت پیدا
جلوت نے کیا طلسمِ حیرت پیدا

وحدت سے منوّر ہے شبستانِ وجود
آئنے نے کیا ہے کثرت پیدا

تاروں کی چھاپ پھولوں کی نئی خوشبو آئی ہوئی
بازار نرالا سے بہار اک روپ اترا

ہمالے میں چھپا پارا ایک تیغ سی نظارا
ارجا وہ کہ جس کا نہ کوئی ارمان نہ روپ

حیرت سے ستاروں کو نکلتے دیکھا
پھر چاند کو بن سنور کے چلتے دیکھا

زر وہ بھی نہیں بس یہ بھی نہیں دل نے کہا
سورج کو بھی جب اُبھر کے ڈھلتے دیکھا

پابند زماں اور نہ محصور جہات
ادراک کی دسترس سے باہر ہے یہ بات
ہر جنبش ذرے میں ہے ذات الٰہ
عالم ہے تمام جلوہ حسن صفات

میں باقی نہیں جب، وہ وفا ہی نہیں ہے
تو بھی باقی مقام پر مستثنا نہیں ہے

میں تیری جستجو میں ہوں سرگرداں
کیوں ہے روا، او روا ہی نہیں ہے؟

پیکارِ اشتغالِ ستمگری کیا ہے
آسودگیِ انجمنِ بیخبری کیا ہے

دلکش ہے بہشتِ حکایتِ قلب و نظر
جو بشکامیِ ذوقِ آزادی کیا ہے

حیرت کدۂ وجود میں نقشِ حیات
آئینۂ اسما میں تصویرِ ثبات
نفسِ کل بھی تصورِ مطلق بھی
تو روحِ روانِ ذات تو موجِ حیات

تنویر ایتدی سحر غنچه‌لری الوان ایله شمدی

ای جلوه‌گه گل سبزه‌لری ابیض الوان ایله شمدی

معموره زمینی ایله بو منشورن

آفاقی پیرازه‌لر الوان ایله شمدی

تغزّل و تصوّف

نسیمِ صبح خاک اور گُل و سُنبل پہ کیے
بینش سا قصور

آتش کو ہوا و صبا اور مُل پہ کیے
دانش کا غرور

سحر کو صبح بے ترتیب غبار صبح کو آتش کو
چھائی کی آگ

آدم کو شعور کا سلسبیل پہ کیے
شعلہ سرِ طور

کیا کیا اُسے غرور ناز بے جا کیا گیا
ہستی سے وہ بے نیازی کیا گیا

چشمِ نو حقیقتِ اشیا کا
دل ایک طلسمِ راز بے کیا گیا

گل ہنستے ہیں اور گلستاں ہنستے ہیں
مہر و مہ و انجم و کہکشاں ہنستے ہیں
ہے شیوۂ تسلیم و رضا خوب مگر
مجبور کے سجدوں پہ انساں ہنستے ہیں

بے نشہ خواہی گزر جاتی ہے
بانازِ شب بسر گزر جاتی ہے
کیفِ گزراں ہے رنج و راحت اے دل
ہر طور سے زندگی گزر جاتی ہے

پیچ بستہ ہری کا وجود جب بھی تو ہے
اس آتش نفس میں اشتر بھی تو ہے

راتوں کے اندھیروں سے ابھر کے دیکھو
باراں تگ و دو میں سحر بھی تو ہے

چھیڑ ساز ایسا نغمے بھی انگیز
یعنی ارمیں نئی ہیں بھی یکسر انگیز
در آنکھوں میں داستانیں تیری ہیں
در آنکھوں سے تبسم سے انگیز
بکھیل نہ ہو

کیوں چشمِ سیاہ کو فسوں کار کہیں
کیوں زینتِ حسن اہل کو گنہگار کہیں

خود ناز و نیاز اعتباری ہے یہاں
کیسی محبت کو گرفتار کہیں

پندار میں انکسار کی بو پانا
تخریب میں تعمیر کا پہلو پانا
احساس ہے شائستگیِ فن کا نام
مشکل ہے مگر فن پہ قابو پانا

یزداں بھی ہے اہرمن بھی بیزار ہے
دونوں کی نظر میں ہے آدمی لائقِ دار
تحصیلِ بہشت ہو کہ دوزخ کا خطر
ہے کاوشِ خیر و شر ہی احساس کا بار

میخوار کو اتنی عطا کر ساقی
سرمست کو سرجوشی عطا کر ساقی
منہ موڑ کے دیر و کعبے سے آیا ہے
شوقی کو ہمیشگی عطا کر ساقی

تنویرِ تجلیاتِ تنِ جانی ہے
تصویرِ تاثراتِ تنِ جانی ہے
کیا شے ہے تصوّر کی اداے رنگیں
تقدیرِ تعیّناتِ تنِ جانی ہے

تبیینِ مجاز پہ حقیقت کا مدار
تحسین و تلطّف پہ محبّت کا مدار
اللہ کی رحمت پہ ہے بخشش موقوف
تشویقِ امت پہ ہے رحمت کا مدار

بی بادهٔ عشرت و کامرانی تنها
بی لطف نشاط شادمانی تنها
بی فرصت عمر بهر یک ساعت بیکار
بی لذّت درد و زندگانی تنها

به رنگ گل از فروغ همین شب تو بینی
بیاد صبا و زمین شب تو بینی

تنویر رخ ماه سیمین صحبت شب
تصویر سحر بدین شب تو بینی

سینۂ پتھر کی سرخوشی مجسم ہو جائے

عاشق کی اسیری کی مجسم ہو جائے

وہ نغمہ جو چھپے پڑے سینۂ دل اور

زبان تک بیخودی میں مجسم ہو جائے

دل کاو نشد ز جمله اسباب آزادی
خود حسن نیاز عشق را نازی
بر صورت و صدای عشق بود نغمهٔ حسن
بر نغمه دهی سپر دل بازی

کیا حسن فروغ کار ہیں یہ ساقی
کیا لطف بر اضطراب ہیں یہ ساقی
پابستہ حکمت ہے حقیقت کی لگن
کیا کیا ہمہ اختیار ہیں یہ ساقی

یہ عکس ہے میں پائندہ و فان رہنا ہے
یہ دور ہے میں حق و دیں آشنا رہنا ہے
انسان کی معراج، جنابِ تقوی ہے
یہ حال ہے میں راضی بہ رضا رہنا ہے

پندار کے خول سے نکل کر دیکھو
کبھی فن کا انداز بدل کر دیکھو

بیگانۂ زنجیر و شرر ہو، نیا سوچو
نہ قالبِ زنجیر و شرر میں ڈھل کر دیکھو

بار خاطر ہمہ تن زار گلُ بدامن نکلا
یہ گل نکہت بہار جو بیتیں گلشن نکلا
یہ گل یہ سے اک رنگ زرے سے کا
سے دیکھا جو بہ مسکن نکلا
دل تیغ تیری یار کا
سرِ محبوب جہاں

مطلوب ہے جنت، تری آرائش کے سبب
محبوب ہے دوزخ، تری چاہت کے سبب

قسمت میں حضوری ہو کہ دوری اے دوست
راحت ہے، عنایت تری نسبت کے سبب

آئینۂ دل غبار آلود نہیں
حدِ افقِ نگاہ محدود نہیں
آسان ہی بہت مسئلۂ خیر و شر
سر رشتۂ شمع زیرِ دود نہیں

اک عمر کے بعد دوبارہ آیا ہوں
ساقی کے حضور عذر خواہ آیا ہوں

نظروں میں ہیں زندگی کی تشبیہیں
سینے میں لیے ذوقِ گناہ آیا ہوں

وہ لطفِ خرامِ نازِ ساقی نہ رہا
وہ کیفِ خمارِ ذوقِ باقی نہ رہا

وہ جوشِ شباب وہ نگاہِ رنگیں
آئینۂ حسن اتفاقی نہ رہا

سربستگیِ غنچش یاد آئی
دل بردگیِ اسبابِ حیا یاد آئی

وہ ساعتِ خوش کہ تھی قرانُ السعدین
وہ ساعتِ آئینہ نما یاد آئی

جب گیسوئے شب [illegible] بکھر جاتے ہیں
ہم طرۂ شعر کے سنور جاتے ہیں
سلجھاتے ہیں جس قدر زمانے کے [illegible]
رخسار اُسی قدر نکھر جاتے ہیں

دل پہ میرے اے حبیب کھلتے ہیں اسرارِ وجود
ہو جاتے ہیں روشن در و دیوارِ وجود

وہ روحِ فرسندہ منتظرِ ہستی گیا
رجائے گو دی برسرِ بازارِ وجود

بادہ کشی شباب سے ڈرتا ہے
افسوس اگر کوئی شراب سے ڈرتا ہے
گر خواب تھی زندگی تو اک خواب مبہم
سوتی شب و روز خواب سے ڈرتا ہے

جب شدّتِ کرب سے مچل جاتی ہے
سوز و تپشِ غم سے پگھل جاتی ہے

فنکار کی روح حسنِ زیبا بن کر
اک پیکرِ مرمریں میں ڈھل جاتی ہے

نیرنگیِ شوق منفعل یار دنیا
اک طرز طلسم آب و گل یار دنیا

غایت کی تجربہ سے نہایت کا پتا
یہ صورت اضطراب دل یار دنیا

بے آب ہے، بے رنگ ہے، آئینہ تو
بے تاب ہے، دل تنگ ہے، آئینہ تو

جلوؤں سے کسی کے آباد تھی ورنہ
بے جلوۂ رخ سنگ ہے، آئینہ تو

سینے کے گداز سے دہکتے جاگے بدن
انفاس کے سناٹے سے کھنکتے جاگے بدن
پھولوں کی طرح شگفتہ پیکر نیم باز
آغوش میں آئے تو پگھلتے جاگے بدن

سرمستیِ چشمِ سُرمہ سا یاد آئی
کیفیتِ شوخیِ حنا یاد آئی
تابندگیِ مصحفِ جاناں کی قسم
وارفتگیِ زلفِ دوتا یاد آئی

فردوسِ نظر ہے جبینِ امکانِ خیال
ارژنگ بنا ہوا ہے دامانِ خیال
جب اُس گلِ نورستہ کی یاد آتی ہے
سوتے میں مہک اٹھتا ہے شبستانِ خیال

بی‌سود همه امتیاز بود و نابود
عالم همه اسیر حلقهٔ دام وجود
نیرنگ شهود همه جهان هستی
فردوس عدم همه عالم نامشهود

صہبا کی طرح جلوہ نما ہے ساقی
پیمانے کی طرح دل کشا ہے ساقی
تابانیِ رخ، شوخیِ لب، غمزۂ ناز
سراسر جوش آشنا ہے ساقی

کیا تجھ سے کہوں کیسے گزاری ساقی
آنکھوں میں کٹی ہیں راتیں ساری ساقی
جذبہ بھی اگر اپنا ہے اثر کی طرح
چاہت بھی ہے جو بے اختیاری ساقی

جب جام بکف وہ سرو آزاد اٹھا
تعظیم کو یار عاشق دل شاد اٹھا
ہر تازہ جوان پکارا ساقی ساقی
ہر سمت سے اک حشر فریاد اٹھا

ارباب نظر ڈھونڈ رہے ہیں اس کو
تا بینش گمرہ ڈھونڈ رہے ہیں اس کو
وہ وقت سے بے نیاز کہاں ہے یارو
جو پائے ہنر ڈھونڈ رہے ہیں اس کو

سبب عالم وجود و حال سنسن باقی ساقی
سبب مرتبهٔ کمال سنسن جه ساقی
بر آن زمانه خیال سنسن اما
سن نقش لازوال سنسن باقی ساقی

اک لمحۂ نازِ کامرانی کے لیے
اک ساعتِ کیفِ شادمانی کے لیے
چُن لی ہیں چمن چمن سے نودمیدہ کلیاں
زینتِ عروسِ زندگانی کے لیے

آرائشِ زلف، شادمانی کے لیے
زیبائشِ حسن، جاودانی کے لیے
سینچی ہے جگر کے خون سے کشتِ مراد
شادابیِ نخلِ زندگانی کے لیے

کچھ نقشِ تسلسلِ زمانی کے لیے
کچھ عکس تغیّرِ مکانی کے لیے
ہم نے مہ و مہر پر کمندیں ڈالیں
تکمیلِ شبستانِ جوانی کے لیے

عشق ایک پناہ ہے جوانی کی
عشق ایک عصا ہے زندگانی کی

سنگ شوق پر تیز ہے دل لقب
بتا الٰہی خامۂ نقش پانی کی

دستار ہے عشق زمزمہ خوانی کے لیے
ہموار ہے حسن ترجمانی کے لیے

بازوئے جواں پر ہیں پریشاں زلفیں
آسودگیٔ خواب جوانی کے لیے

تمہیدِ کتابِ زندگانی کے لیے
دیباچۂ منظومِ جوانی کے لیے

الفاظ میں دل کی بات ادا ہو نہ سکی
اصنام تراشے ترجمانی کے لیے

بنمودی شرر از سنگ به یک جلوه نما
برنگ عجب از سنگ به یک جلوه نما

همه عالم به صورت و صدایش نگاه
بنقش کس از سنگ به یک جلوه نما؟

آینه پشت تنگ است بین اشتر لو پشید

پر ابریشم تنگ است بین بنیر لو پشیده

اطرفو قیامت هیکل پشیده قامت

بی سایه بر سنگ است بین چشم را لو پشیده

یہ مہر و مہ و نجم و گل و لالہ ہیں
یا موجۂ رنگ و کیفِ صہبا ہیں
اک واہمہ اک خیال آتش تو لو
اس حسنِ گریزندہ پا کو کیا کیا ہیں

گردش میں جہانِ گذراں کی سب
دورانِ سفر میں کارواں کی سب

آئینہ جو تھا برنجِ ہستی تو کھلا
رنج کی تہ ملا آتشِ گرجاں کی سب

تَمَوُّج و تَعَشُّق

ذوقِ نظر سے آئینہ کامل ہو جائے
نظارہ بھی جو ذوقِ نظر میں شامل ہو جائے

کاش آپ اُلٹ دیں رُخِ زیبا سے نقاب
دنیا کا ہر امتیاز باطل ہو جائے

تابانیِ جلوہ ہے جس سے ہر دل میں
پائندگیِ مہر ہے مہِ کامل میں

عقل و شعور
آیا ہے کہاں سے جو ہے مجھ میں
اس پیکرِ برق و باد و آب و گل میں

اک نغمۂ بے صوت و صدا رکھتا ہوں
اک قلب بسروار آشنا رکھتا ہوں

شائستگیٔ غم سے ہوئی دل کی نمو
اب جام مے وفا کا حوصلہ رکھتا ہوں

گر جرأت شوق آئینه ساماں بوجا
با ماه جبیں بمهر پرداز درخشاں بوجا

جلوه به ہوس نظر گلستاں منع بود از وصال
دل از رو بشیشه آئینه حیراں بوجا

بر عیش و نشاط و بزم مرغوب بخند
بر عشرت چشم و ابروی کش مطلوب بخند

بر داغ گناه بی عزیز از دل و جان
بر صورت و خال و رخ محبوب بخند

اُف گردشِ ایّام کہ شب جاتی ہے
گردش میں ہے جام کہ شب جاتی ہے
ساقی تجھے اندیشۂ فردا کی قسم
لا بادۂ گلفام کہ شب جاتی ہے

یوں منفعت میں جیسے کا خانہ الہام اٹھا
اٹھ اور ابر آسماں پہ پردہ کا و بام اٹھا

ہے جام صد زندگی آسماں سرور و مستی
پی اور پلا جام اٹھا جام اٹھا جام اٹھا

انساں کی چتاؤں سے جگمگاتی ہوئی رات
پیار کی دعاؤں سے مسکراتی ہوئی رات
چھپی ہوئی شام
آغوش کی گرمی سے پگھلتی ہوئی رات
احساس طرب سے گنگناتی ہوئی رات

کیا یہ ہوائے نفس سے تنگ ہیں بہت
تیری رضائے نفس سے تنگ ہیں بہت

لو شیخ بھی میکدے میں در آئے ہیں
ہم تو صدائے نفس سے تنگ ہیں بہت

بے شورشِ رندانہ وجود سے کیا؟
بے ساغر و پیمانہ نمود سے کیا؟
بے گرمیٔ چشمِ مست بے رنگ ہے ہم
بے لغزشِ مستانہ شہود سے کیا؟

سیرابیٔ تشنگی کا امکان کہاں ہے
دل لے کے یہ تسکین کا سامان کہاں ہے

ہنگامۂ فراق ہو کہ ہنگامۂ وصال
جاتا ہے کب قلب کا ہیجان کہاں ہے

اک پیکرِ آوارہ کے سادہ خطوط
اک شوخ طرحدار کے سادہ خطوط
دعوائے ہنر بجا ہے شوخی لیکن
کھنچیں تو کھنچیں یار کے سادہ خطوط

پیک تو نوا از شوق پیمبر آیا
پھر لطف و عنایات سے گراں بار آیا
مغرور نیاز از بس کہ آیا پیچ
صہبائے غم عشق کی سرشار آیا

سرمستیِ چشمِ یار بھی کم سی ہے
بالیدگیِ خمار بھی کم سی ہے

جلوہ بھی باورِ معتبر نہیں ہے شوق
آئینے کا اعتبار بھی کم سا ہے

حکمت و معرفت

ظلمت سرِ شام گلستاں پہ کھنچی ہے
سورج کے سفینے کو ڈبو دی ہے
منہ پھیر کے روشنی بدلتی ہے لباس
اک جامۂ شب تاب پہن لیتی ہے

آزاد روی ز موج تلاطم آگاهی کش
محدود احاطهٔ عقلش ز جمع آگاهی کش

ای حیرت کده از نیستیات معلوم زمین
دور از تصور شده و آگاهی کش

تمہیدِ تجلیات بھی ہے ساقی
دیباچۂ واردات بھی ہے ساقی
محتاجِ توجہ ہے ہر اک بابِ ابد کا
دل مرکزِ کائنات بھی ہے ساقی

چو درد سر دل ببین و بی آوازیست
چو سوز سر روح بین و بی سازیست
با این همه درد و سوز و ساز از مستی
بر کاوش زخمه پردازیست

غنچوں کی ہنسی، رقصِ بہاراں کی ادا
شبنم کی نمو، صبحِ خنداں کی ادا
تیارِ شبِ غم کیا، لو دیے دل کو آگ سی
ضبطِ تپشِ نیم تہِ مژگاں کی ادا

پرواز کا دائرہ ہے اپنا اپنا
حالات کا جائزہ ہے اپنا اپنا
زاہد بھی سبو بدوش ہیں مست ہیں رند
ہر ایک کا معاملہ ہے اپنا اپنا

دنیا کی مصیبتیں گھٹائے نہ گھٹیں
احباب کی حسرتیں بڑھائے نہ بڑھیں

ہم نے جانا تھا بے نیازی اب ہیں
احساس کی گتھیں سلجھائے نہ سلجھیں

قرطاسِ گل و لالہ پہ نقش و نگار
جلوہ زارِ رنگ و بوئے اعجازِ بہار
موجوں کی سبک روی میں نیرنگیوں کا سرور
فطرت بھی ہے کتنی سادہ کتنی پرکار

افسردگی از رنج و ملال اے ساقی
پیچیدہ ہیں بار بار جب سال اے ساقی
ہر چند کہ گشتہ عمر بر باد لیکن
خوش باش کہ نیست کار زوال اے ساقی

پاس ننگی خیال کرتے ہیں

ہستی گلکی جلال کرتے ہیں

آستیں کی ذوق ہے

پیچ و پیچ و عیش وال کرتے ہیں

یہ رونقِ نگارِ زندگی کیا کم ہے
یہ کیفِ خمارِ زندگی کیا کم ہے
ہاں ہستیٔ مستعار فانی ہی سہی
یہ رقصِ شرارِ زندگی کیا کم ہے

احساس کی آگ و تپش میں ہے فانوس خیال
تخیل سے روشن ہے اطراف آگاہ سے کمال

اک سمت منظر افسردہ و مسرت آگیں
اک وحدت آہنگ و تناسب جمال

یہ سمتِ مسرّت کی نمائش ٹھہری
یہ پاکیٔ دل وجہِ تسلّی ٹھہری

بعثت بھی سولی کی عقوبت بھی عیاں
کیوں عیسیٰ سے نبی آزمائش ٹھہری

ماہیتِ حسنِ کائناتی کیا ہے؟
کیفیتِ جوہرِ حیاتی کیا ہے؟
دل در پئے آسودگیِ نفس ہے کیوں؟
ماہیتِ ارتقائے ذاتی کیا ہے؟

انگشت بدنداں ہیں یہاں آکے عاقل بھی
مضطر ہیں یہاں آکے عارف کامل بھی

غایت بھی ہے آکر مسئلۂ غور طلب
ہے جستجو طلب، حیات کا حاصل بھی

نیاز نظر ای عمر فانی تو کجا؟
آن خواب ای عشرت جوانی تو کجا؟
این دو سه روزه عشرت باز
ای یار کار زندگانی تو کجا؟

تشکیک سے تردید کا اک پیچ
تردید سے بیعت مغاں کا اک پیچ
تحقیق نے ڈالی ہے ستاروں پہ کمند
تقلید کی راہ سے کہاں تک پہنچے؟

امواج تو ہیں سطح سے گزرنے تو دو
گیسوئے تقاضا کو سنورنے تو دو
تحقیق کی منزلیں بھی اُبھر آئینگی
تقلید کا شیرازہ بکھرنے تو دو

گرداب کی گود میں جو پلا ہو سکتے ہیں
موجوں کے تھپیڑے بھی وہ سہہ سکتے ہیں

یہ وقت کے دریا کو پلٹا تو نہیں سکتے
ہم اس کے ساتھ ساتھ بہہ سکتے ہیں

اک لعبتِ صد رنگ نظارا ہستی ہے
اک صفحۂ ارژنگ منظرِ ہستی ہے

نیرنگ ہے، طلسم ہے، یہ دنیا لیکن
شمعِ ضرجِ انسانی نظارا ہستی ہے

کچھ کیف میں جھومتے نظر آتے ہیں
کچھ شمع کو چومتے نظر آتے ہیں
فانوس شبستاں تو ہزاروں ہیں لیکن
کچھ سائے سے گھومتے نظر آتے ہیں

اخلاص و وفا منده زیاده بولسین
انداز نگاهی معتبر بولسین
بر آیینه‌کیم اوبر وصالتی راتب
تحصیل جانانکی ظلمتین سحر بولسین

فنا و بقا

سانس کی طرح ساتھ لگی رہتی ہے
ہر موڑ پہ سامنے کھڑی رہتی ہے
عشاق سے خود موت بھی ڈرتی ہے مگر
بے جان سی قدموں میں پڑی رہتی ہے

سیروین و نجیب عنب ایستر لکن
دل دائما حسرت طرب ایستر لکن
خود جاده زیستی گذرگاه عدم
انسان کوچه شعور سبب ایستر لکن

اک کیف ہے اک حسرتِ تعمیر میں بھی
اک لطف ہے ہوائے تصوّر میں بھی

اک حسن کسی کا نیا ہے مدِّ نظر
اور اک گروہ جنس کی تحقیر میں بھی

موتی کا اب لوٹ لوٹ کر جھومر ہے
نتھنی سے لٹک کے آگئی ہے دوارے
یادوں اب تک گوارا نہیں ہیں
باہم دو جوانیاں
شب نے چادر اتار کے پھینکی ہے

زاہد یہ ہو کہ زندہ ہے جب تک جلیا ہے
زینت ور یہ ہو کہ ہے ہنر جلیا ہے
دل شاد کرو دل آشفتہ جلیا ہے ضرور
بازی عمر کی راہ پہ جیتیا ہے

بیچ بیچ زباں اب ٹوٹی طبیب
یہ ہستی حباب اب ٹوٹی طبیب
بول ہو ٹ ٹ گیا فسون جواب ہستی
ناگاہ کوئی شتاب اب ٹوٹی طبیب

ڈھل جاتا ہے آفتاب ڈھلتے ڈھلتے
بجھ جاتا ہے ہر چراغ جلتے جلتے
اے طبعِ حزیں موت ہی تقدیرِ حیات
کیا بات نہ آئے گی ٹلتے ٹلتے؟

اک پیکرِ التفات سے بن آئی
اک حُسن کی کائنات سے بن آئی

ہرچند کہ جاں گُسل تھا اندیشۂ مرگ
موت آئی تو صد حیات سے بن آئی

کیا بچپن کل آ سکتی ہے؟

کیا موت زندگی بن سکتی ہے؟

معنی میں یہ اختلاف کس شے سے پیدا ہے؟

ہستی با نیستی بن سکتی ہے

یہ گردشِ ماہ و سال آخر کب تک؟
لطفِ خواب و خیال آخر کب تک؟

مجموعۂ اضداد ہے دنیا لیکن
اضداد میں اعتدال آخر کب تک؟

جلوت گہِ محسنات سے گریزاں ہیں
خلوت گہِ سیّئات سے گریزاں ہیں
دم پھول رہا ہے ہاتھ پاؤں شل ہیں
حسرت گہِ نیکیاں سے گریزاں ہیں

چڑھتی ہوئی سورج کی جوانی دیکھی
ڈھلتی ہوئی دن کی زندگانی دیکھی
پرچھائیاں دھوپ چھاؤں بڑھتی سایا
کیا زود و دا حیات فانی دیکھی

نفس یہ ذات ہے کیا ہے معلوم تو ہو؟
نقش حیات ہے کیا ہے معلوم تو ہو؟
کیوں تابع گردش فلک ہے مری خاک؟
یہ تنگنا ہے کیا ہے معلوم تو ہو؟

پارۂ جاں ہو، مستعار آ گزر کر دیکھیے
تا رہا بے منزلا، لے آ سر کر دیکھیے
پیتے تیرے دیکھیے

شوق سر سے جیا تیرے سر کر دیکھیے
کیا تیری حیا آ سر کر دیکھیے

تا کے گلنار رخسار و حسن میں رہتے؟
تا چند اس ایوانِ ہوس میں رہتے؟
گر جست میں ہوتے آگے مراحل سب طے
ممکن ہی نہ تھا سدا قفس میں رہتے

کیوں سلسلۂ نالۂ آہنگ جرس ٹوٹ گیا؟
کیوں زخمۂ بیتاب نفس ٹوٹ گیا؟
بے بال و پری میں اوج پر تھی قسمت
نالوں سے مرے دامِ قفس ٹوٹ گیا

طلب وتمنّا

آسودگی و راحتِ دُنیا مانگوں
بے خوفی و بے فکریٔ عُقبیٰ مانگوں
اے بارِ الٰہا! تیری رحمت کے نثار
کر مرحلے بھی ہیں کہ کیا کیا مانگوں؟

کہاں ادب ایاغ سے ایاغ اے ساقی
جلا ہے جس سے چراغ سے چراغ اے ساقی

ابھی ہے تازہ تشنگی اے ساقی
اسی طرح پلا کہ روشن ہو دماغ سے دماغ اے ساقی

پینے سے مرادِ صرف پینا تو نہیں
مقصودِ نگاہ، موجِ مینا تو نہیں
ہو جنبشِ لب نہاں، ہو ساغر میں مگر
تشخیصِ بہار کی طرح جینا تو نہیں

تنویر رخ حیات است کجایی
تقدیر تمناست کجایی
دل مهر جهان فروز و الاهه‌ی پیام
آیینه‌ی کاشانه است کجایی

افسوں زدۂ اہرمن و یزداں ہوں
زحمت کشِ صد نازِ تنِ این و آں ہوں

دل میں ہے عجب کشمکشِ ظلمت و نور
انساں کی جستجو میں سرگرداں ہوں

غمزوں سے جہاں کے آشنا تو ہو لوں

دنیا سے تری عہدہ برآ تو ہو لوں

ہے مدِ نگاہ حرف تو ہی لیکن

شائستۂ آدابِ وفا تو ہو لوں

فانوس خیال تک رسائی تو ہے
معراج کمال تک رسائی تو ہے
کاش اپنی حقیقت سے بھی واقف ہوتے
دنیائے مثال تک رسائی تو ہے

یہ ازل سے ابد دو سرا ساتھ ہیں
ازول کا بھی ایک سلسلہ ساتھ ہیں

بابو جی تو دو کھو بیٹھے ہم
یہ کام مرے جس سے دنیا ساتھ ہیں

کچھ پردۂ تشبیب کا حق ادا کرتے ہیں
کچھ ذوقِ طرب کا حق ادا کرتے ہیں
اندیشۂ عجزِ بیاں دیوانہ نکلا
کچھ حسنِ طلب کا حق ادا کرتے ہیں

یہ راز ہے پیچ صحرا اک کلیاں گرتا ہے
یہ قطرے سے دریا کا فسوں نکھرتا ہے

اندیشہ غبار کو بناتا ہے پہاڑ
انسان خود اپنی سانس سے ڈرتا ہے

بیزاری و بیگانہ شعاری کب تک؟
دعوائے جنون، ہوشیاری کب تک؟
ہر جنس بکارتی ہے دو دن میں ہوں
دنیا کو ہے آج کا اعتباری کب تک؟

تا بر رخ ساقی است گیسوی کمند باید بود
بر زلف بتان سلسله مشعله باید بود
گر آتش است تمثال بروی چراغ باید
دل حسن طلب است ناقص آید

مستقبل و ماضی کی حقیقت معلوم
دیروز ہے معدوم و فردا موہوم
امروز ہے جس سے کارگاہِ امکاں
آئینہ ہے حکمت ہائے مکتوم

بادہ مقصود و باہم پیش نظر است
تن گرچہ پیش نظر است
عالم ہمہ آئینہ اسرار الٰہی
کس ساز خود پیش نظر است
یا جنبش کہ خاموش نظر است

سرخی ہی نہیں رنگِ حنا میں تنہا
شوخی ہی نہیں ہے گل کی ادا میں تنہا
ہے لذتِ پوشیدہ زِ رنگ و بو بھی
مستی ہی نہیں رقصِ صبا میں تنہا

کب دائرۂ ہوس و گماں سے نکلے؟
کب کشمکشِ سود و زیاں سے نکلے؟

ہر دشت میں پری زاد جست صبا کے مانند
کب سلسلۂ دور زماں سے نکلے؟

گلہائے نگارِ فتنہ بساماں کی طرح
شبہائے کسی کی زلفِ پیچاں کی طرح
کیا تم سے کیوں حقیقت نصیب ہو گیا؟
ارے دو تیمن ساحے نازِ جاناں کی طرح

شمعِ اشک بھی پیتی ہوئی ہوگی کہیں ساقی
شمع سو بار بجھا اور بجھا بے نیز ہیں ساقی

نشہ سا ابل رہا ہے آنکھوں سے تری
کیفیتِ چشمِ سیہ کیا ہے ہیں ساقی

اَنا و اِنا

ناونا

پھولوں کے تبسم سے گلستاں روشن
تاروں کی ضیا سے چرخِ گرداں روشن
معراجِ خودی اسکی ہے عرفانِ انا
عرفانِ انا سے دلِ یزداں روشن

الماس جدا، شیشہ جدا، سنگ جدا
انداز جدا، رنگ جدا، ڈھنگ جدا
اوروں سے ہی مختلف ہے مرے دل کا چسکا
ہر نغمہ کو درکار ہے آہنگ جدا

بیگانه ز شیخ و برهمن ای واقف راه

تو ای ز حقیقتت نئی خود آگاه

جا جسم و سرا خود ای کی ز نبی

به فعل عبادات به از فعل گناه

یہ شمع بجھاؤ نہ تجلی سے پہلے
لو دل میں لگاؤ نہ آوازوں سے پہلے
لو دل پہ اٹھا تو شوق کی
خود دل سے صدا آئے انا الحق
آنکھیں تو ملاؤ ذرا گفتگو سے پہلے

مستی کا تقاضا ہے کہ مستی میں ہوں
ہستی کی تمنا ہے کہ ہستی میں ہوں
ہیں جاری و ساری ز ازل تا ابد
لاریب محیطِ اوج و پستی میں ہوں

معلوم نہیں کہ ہم ہیں یہ ہیں نہیں سب وجود
میزان جہاں میں ہیں یا ہیں سب وجود
رہ رہ کے یہ دل سے صدا آتی ہے
ہم ہی سے ہوا آشکارا سب وجود

کھلتا یہ نہیں راز کسی پر بے دل چیرے
اے دوست کھلے گا بھید دھیرے دھیرے
یہ جن کو رباعیاں سمجھا ہے جہاں
انمول رتن ہیں بیش قیمت ہیرے

ہر سنگِ ملامت کا نشانہ ہیں ہموں
ہر سود و زیاں کا شاخسانہ ہیں ہموں
از صبحِ نخستینِ ازل تا بہ ابد
جولانگہ عالم ہوں زمانہ ہیں ہموں

یا ذوقِ شعورِ نفس بیدار کرو
یا اپنے وجود سے بھی انکار کرو

ہستی مری مبنی ہے اثبات پہ
فطرت کا تقاضا ہے کہ اقرار کرو

وابستۂ غمِ چمن ہیں اے تتری
آمادۂ پرواز ہو وطن میں اے تتری
فانوسِ خیال اگر نہ روشن کرتے
یہ بھی کبھی انجمن میں اے تتری

یہ غنچے کو دیا تبسّم کا مجاز
یہ بُت کو سکھائے تُو نے جیوں سے انداز

یہ سینے میں دھڑکتا ہے میرا ہی دل
یہ ستار ہی ہے میری آواز

ہوں خوگرِ گلبانگ تعلّی میں ابھی
ہوں اپنے لئے وجہِ تسلّی میں ابھی
ہوں ایسے ارکانِ گنج
پیچ ہے آئینہ بھی جیسے
ہوں تیرے ہی پرتوِ تجلّی میں ابھی

جب بچائے زلف کا زاویہ بن جائے
جب بچائے مرا استعارہ بن جائے

تیری نگاہ میرا دل میری پناہ
شعلہ کی لپک سے دائرہ بن جائے

فرہاد یہ لب بے نفس کی یہ خواہش

کیوں مضطرب سب ہیں نفس کی یہ خواہش

تحقیق طلب ہے نفس کا یہ آرزو ست

تعبیر طلب ہے نفس کی یہ خواہش

کیوں حُسن گوارا کرے آلودگیٔ کاوشِ تمنّائے کسی؟
کیوں عشق گوارا کرے آشفتگیٔ کاوشِ تمنّائے کسی؟

منظور ہے سبکیٔ نفس کی آئین
کیوں نفس گوارا کرے آدمیٔ کاوشِ تمنّائے کسی؟

آہنگِ جرس، صوتِ ہزار ہو جائے
کیفیتِ احساس، مصوّر ہو جائے
شعلہ کو چھوئے بغیر زیتون کا تیل
انوارِ تجلّی سے منوّر ہو جائے

م وجاہی

نغمہ کوئی صوتِ نفس سے ابھر سکے تو؟
شعلہ کوئی گلوئے نفس سے ابھر سکے تو؟
لفظ سے الہام کے سوتے بھی ہیں
یہ سطحِ شعور نفس سے ابھر سکے تو؟

ادراک کی سطح سے ابھر کر دیکھو
احساس کی وادی سے گزر کر دیکھو
ہستی دولت بے بہا کا گنجینہ ہے
پہنائی نفس میں اتر کر دیکھو

خنداں افقِ صبحِ بہاراں کی طرح
دمکتی سی آئینۂ ایراں کی طرح
مست ہو چکے یہ بتکدہ زنفس ہو گیا
اک عالمِ راز بے شبستاں کی طرح

ترے لعل سے خونریزیِ نفس کا نام
یکنفیر ہے خونریسیِ نفس کا نام

آسودگیِ نفس ہے باریست نہیں
تسلیم و تسلیِ آشتگیِ نفس کا نام

وارفتگیِ شوق کی تفسیر ہیں ہم
ناسازیِ احوال کی تصویر ہیں ہم
اک خواب کی تعمیر ہے ہستیِ کون و فساد
اس خواب کی تعبیر ہیں ہم

عرفان ہے خود آگہی نفس کا نام
ایمان ہے تابندگی نفس کا نام

گھنٹی کی سی آواز چلی آتی ہے
الہام ہے خود کلامی نفس کا نام

ہستی کا ہمیں ناز از بس وہم ہے

ہستی کا تماشا سیف و فہم ہے

ادراک و خرد بھی ہیچ ترے ہیں ہے

انداز جنوں بھی ہیچ تر ہیں ہے

پیمانۂ ننگ و عار تھا ٹوٹ گیا
آئینۂ اعتبار تھا ٹوٹ گیا

شائستۂ ذوقِ عشق تھا دل نہ رہا
میزانِ حسنِ یار تھا ٹوٹ گیا

دیکھا ہے حقیقت کو بانداز مجاز
ہے پیش نظر طلسم ناز باعجاز نیاز

ہستی بھی فسانہ ہے نیستی بھی افسوں
پردہ بھی ہے طلسم راز در پردہ راز

رنجوری و مہجوری میں کیا رکھا ہے؟
سیرابی و تشنگی میں کیا رکھا ہے؟
لے آیا ہے شوقِ دیدِ ساقی ورنہ
میخانۂ زندگی میں کیا رکھا ہے؟

سکوت و صدا

اس بات سے گھٹتی ہے طبیعت کیا کیا!
درپیش ہے دنیا کو مصیبت کیا کیا!
انسان کی فطرت میں ہے ایثار مگر
انسان کو ہوتی ہے ندامت کیا کیا!

ظلمت میں شراروں کی ضیا کہہ سکتے

ہنگامِ سحر بادِ صبا کہہ سکتے

تسوی ہیں

بیکار ہے وفا کی جستجو تیری

یعنی ترسکوں تیرے جب کو وفا کہہ سکتے

ہے عشق کی ابتدا بھی عجز و حیرت
ہے عشق کی انتہا بھی عجز و حیرت
کس چیز کی جستجو کرے دل کیا ڈھونڈے دل؟
مقصود بھی مدعا بھی عجز و حیرت!

یہ پھول کی شوخی پہ مچل جاتا ہے
یہ شمع کی گرمی سے پگھل جاتا ہے

یہ حال ہے حسرتِ سکوں میں دل کا
تسکین کی صحبت میں بہل جاتا ہے

وہ شبِ ہجرِ عشق کا صدمہ بھی گئے

وہ جنسِ حسن و وفا بھی گئے

وہ قحطِ انسان و صحبت و وفا کیسوں ہیں

دنیا ہوئی کسی کو آشنا بھی گئے

آئے کوئی جیسے شاہ چپکے چپکے
یوں آتے ہیں دیں پناہ چپکے چپکے

یہ حضرتِ محتسب بھلا کیا جانیں
لیتے ہیں قدم گناہ چپکے چپکے

میرے لیے ہیں دردِ جگر کا فن ہے
تیرے لیے ہیں دیدۂ تر کا فن ہے

تحسینِ سخن کا مسئلہ نازک ہے
خاموشی اربابِ ہنر کا فن ہے

اقرار خودی گنہ اک طرح سے ہے
ہستی کو عدم بنا اک طرح سے ہے
زیادہ شوخی ہے
مانگ یہ ستم گر سیوں سے
خود بار وجود اٹھا اک طرح سے ہے

اخلاص کا قحط اور محبت عنقا
سنجیدگی محال اور وصلت عنقا
دامن کوتاہ و دست حرص دراز
رخصت معدوم اور فراغت عنقا

اک لطف مزید کے سوا کیا چاہیوں ؟
اک عید سعید کے سوا کیا چاہیوں ؟
کیا کیا نہیں اعتماد تجھ پہ لیکن
بجز تری دید کے سوا کیا چاہیوں ؟

لذت کش کیفیت انگور و بو تشنہ ہیں
تشنۂ ذوقِ مے آرزو و آرزو تشنہ ہیں

دل بہم سے مئے گفتگو اشتیاق ہے
ہمدل سے مئے گفتگو کے تشنہ ہیں

انیند کا ہے انتظار اور نیند پہ ہے خواب؟
بیداری بھی منحصر ہے سونے پہ ہے صواب؟
اضداد کا نام اگر زندگی ہے عجب؟
ہونا بھی ہے موقوف نہ ہونے پہ ہے جواب؟

اظہارِ حسرتِ دلبرانہ بھی تو قفس
اندازِ نگاہ محرمانہ بھی تو قفس

بیمار کی خونِ تمنا کی قسم
گلشن بھی تو قفس ہے آشیانہ بھی تو قفس

گر جام مئے کہنہ و باقی ساقی!
گر جرعۂ آتش عراقی ساقی!
پیش تو بجام مئے شب ماہ
ہنگامۂ حسن اتفاقی ساقی!

بہر رنگ سبھی پشن کوں دے بیدار کیا
اک تیں تیرے سیں دل ہشیار کیا

قصدًا بھی کبھی سبھی بھلانا چاہا
بے قصد بھی بار بار تجھ یاد کیا

میخانۂ زندگی پیے جاتے ہیں
ہر سانس گراں بار لیے جاتے ہیں
ہرچند کہ آتا نہیں جینا لیکن
زندہ ہیں حسب ضابطہ جیے جاتے ہیں

صد آئینہ بردوش نظر آتی ہے
ہر جبینہ ضیا کوش نظر آتی ہے

فانوس شبستاں ہی پُر اسرار نظر آتی ہے
خود شمع بھی کل یعنی پیش نظر آتی ہے

کیوں ارزاں نہ کیا رات ہیں ساقی ساقی؟
ہے ذوق مراتب ابھی باقی ساقی!
ساقی تجھے گستاخ ہیں بلانوش مجھ سے
کیا یہی ہے امرِ انصاف ساقی؟

چاپیق توتونگ ایاغ آچاتینگ
محفل بیریب بیت چیراغ آچاتینگ
تکلیف سامان توبه بیتیب بیر لیکین
داران و فنا ایچره داغ آچاتینگ

اس میکدۂ عیب سے کیا کام ملے گا؟
اس شعبدۂ طرب سے کیا کام ملے گا؟

کتنے یہیں ہیں، یہیں اور آنکھوں سے نہ پیچھے ہٹنا!
اس حسرتِ روزِ شب سے کیا کام ملے گا؟

شمشیرِ زباں ہے بے نیام اے ساقی
ہے توسنِ وقت بے لگام اے ساقی
لا بادہ کہ بھر نہ جائے پیمانۂ عمر
پیمانِ وفا ہے بے دوام اے ساقی

ہر موج میں طوفان بھی ہے ساحل بھی ہے
ہر ذرے میں دھڑکنیں بھی ہیں دل بھی ہے

ہر منزلِ ارتقا میں ہر اک عالم
ہر عالم خود ایک منزل بھی ہے

نظروں میں ہے کیفیت و کمِ اشتیاقِ حیات
جیسے الٹ رہا ہوں اوراقِ حیات
نفس میں ہے اک کشمکشِ ترک و طلب
گہوارۂ آرزو ہے آفاقِ حیات

آمد سے ہوئے سیلاب کے پانی کا خیال
بکھری ہوئی موجوں کی روانی کا خیال
جیسے دمِ صبح لوٹتا سا نشّہ
اس طرح سے آتا ہے جوانی کا خیال

سورج کی کرن ابھری ہوئی جیسے
دھندلی سی فضا نکھری ہوئی جیسے

اس طرح سے یاد آرہا ہے کوئی
بستی میں پری اُتری ہوئی جیسے

لذّات سے مخمور ہے انساں کا ذہن
اوقات سے محصور ہے انساں کا ذہن
ہے حلقۂ تہذیب میں شخصیّت گم
حالات سے مجبور ہے انساں کا ذہن

طائر ہیں صدا بلب کہ گل ہائے اٹھا
یہ جشنِ طرب کہ گل ہائے اٹھا

سورج کی کرن نے کہا یاد ہے صبح
ڈرا سے خطا تسب کہ گل ہائے اٹھا؟

مسکن ئې کړه کاشانه ئې معلوم تر نه وو؟
بستي ئې کړه ویرانه ئې معلوم تر نه وو؟
صورت ئې کوي آئینه ئې کړه دل
کعبه ئې کړه بتخانه ئې معلوم تر نه وو؟

کچھ دیر سب سے بے رخی بھی کر کے دیکھیں
کچھ عقل سے سرکشی بھی کر کے دیکھیں
کیوں سارا جہاں اسی پہ اکتایا ہے؟
کچھ نفس سے دوستی بھی کر کے دیکھیں

منظروں میں ہے ساری زندگانی ساقی
آئینہ بنی ہے چشم جانی ساقی
جسطرح تمنا [illegible] کھلا جائے
کھلا آتی ہے اسطرح جوانی ساقی

پیمانه‌یه زر و سیمه نه لازم اولور؟

عرشیه‌یه کیف و سکره نه لازم اولور؟

سن طرفه ستمده دلکی تنوّع طلبی

یاردن تصنّعه سببه نه لازم اولور؟

جو کچھ کہ تصور میں عیاں ہوتا ہے
وہ عالمِ ہستی میں کہاں ہوتا ہے؟

ہر نقش نظر آتا ہے دھندلا دھندلا
ہر چیز پہ سایہ سا گماں ہوتا ہے

اک عالم بے مثال میں رہتا ہوں
یعنی بزم خیال میں رہتا ہوں

بیگانۂ دہر بے نیاز شب و روز
سرشار انا ہوں حال میں رہتا ہوں

تاب و تبِ آفتاب میں کیا دیکھا؟
نورِ شبِ ماہتاب میں کیا دیکھا؟
نیرنگیٔ کائنات میں کیا پایا؟
ہستی کے طلسمِ خواب میں کیا دیکھا؟

آزردۂ طلسمِ آرزو ہیں تنہا
افسردۂ جہانِ ارمانِ دل ہیں تنہا

ویرانۂ غبارِ راہِ منزل کی طرح
پھرتا ہوں کسی کی جستجو میں تنہا

امواجِ تہِ جو آب سے اُٹھے آرزو کوئی؟
گہوارۂ مینا سے اُٹھے آرزو کوئی؟

شوق وا ہوں ہزار آغوش بن کر
مینا سے مینا سے اُٹھے آرزو کوئی؟

ہوں تو ہے حسن ہی سے کچھ آرائشِ جاں تک قریب
آجاتا ہے خود ہاتھ اگر ساماں تک قریب

آجاتا ہے

ترے پائی ہے کیا کیا دلِ صد پارہ کو
احساس کی آرزو منزلِ جاناں تک قریب

پہچان سکے ہیں تانے بانے کا مزاج
احساس پہ بار ہے فسانے کا مزاج

اے دوست زمانے کی نزاکت معلوم
ناسازیٔ زیست ہے نئے زمانے کا مزاج

فکر و فیض

پیمانۂ وقت اختیاری تو نہیں؟
یہ طول، یہ عرض اعتباری تو نہیں؟
یہ سمت و اوزان، یہ میزان، یہ مسطر، یہ شمار
انسان کی یہ دسیسہ کاری تو نہیں؟

کیا شے ہے تصورِ زماں اے ساقی؟
کیا چیز ہے یہ تعینِ مکاں اے ساقی؟
پیمانۂ وقت ہے مکاں کا مسطر
خود وقت ہے نبضِ کہکشاں اے ساقی

گنجینۂ حسرتِ فراواں نکلا
دل کاشانۂ نازِ غمِ جاناں نکلا

اس دورِ فسوں ساز میں حیرت کیا ہے
ہر قطرۂ خوں حریفِ دوراں نکلا

کیا یک سلسلۂ شوق کی تدبیریں ہیں؟
ایوانِ حیات کیسی تعمیریں ہیں؟

یا خواب ہی یا شرمندۂ تعبیر الگ
اس زیست کو ہر خواب سے تعبیریں ہیں؟

شوقِ گنہ احتساب سے مستغنی
ذوقِ طاعت ثواب سے مستغنی

لازم ہے یہی، بے حساب دولت کے لیے
دولت کی ہوس حساب سے مستغنی

اے ښکلی ذوق ته خامي کښې؟
پېروئ عارف و عامي کښې؟

سړے مخیط ټکیلے پښې ښځ تو وے
اے عمره روان ته پېته کامي کښې؟

جب طبعِ حزیں اِذنِ بیاں پاتی ہے
کیفیّتِ غم شعر میں ڈھل جاتی ہے
ہر لفظ میں میرا دل دھڑکتا ہے مگر
آواز کہیں دُوری سے آتی ہے

اے کاش زبانے پیتے پیتے سب جل جا
دم بھر کو یہ ہنگامہ سمیتے پیتے پیچ جل جا

آنکھوں سے تری جھلک رہی ہے صبا
سنگیت کی لے آسلوتیں میں ڈھل جا

تابانیٔ مطلعِ سحر کس کی باشد
تاریکیٔ سینۂ اہرمن کس کی باشد
بیداد طلب حیات کا ہے پہلو
رعنائیٔ شوخیٔ نظر کس کی باشد

آرزو وقتِ جاں دادن تمہیں دیکھا کرے
کیا کیجے کہ جیب عشق کا حاصل ہے

آشفتہ سری ضبط گری ناز ہستی
بے منت و تن پرداوا قابل ہے

کب شادی و غم پہ اعتبار آتا ہے
ہر چیز بہ اندازِ جمال آتا ہے

آنسو کہ تمنا ہیں وبالِ جاں ہیں
ہر غنچۂ افسردہ پہ پیار آتا ہے

یہ دل کے بس میں نہیں تیرا ناز مرا آتا ہے

یہ سانس نہیں سانس کا پیغام آتا ہے

نازاں ہیں جو ان کو بھی یاد رکھنا چاہیے

اک تیغ جانفزا انداز مرا آتا ہے

نیناں ہوں تو بن سنور کے اٹھلا کے چلیں
ہوں ساتھ تو آگے آگے بل کھا کے چلیں
جی میں ہے یہ بن کے ٹھیلیں تتے سے چلیں
چلنے میں ہے یہ جنبش کہ ستارے سے چلیں

آنکھوں میں خمارِ خواب جھلکے ہے
پیراہن سے شباب جھلکے ہے
ہر شعر میں جلوہ گر ہو اِس معنی
شیشے میں شراب ناب جھلکے ہے

این عالم پر آب و گل بسی گذرد بی تو بسی
ای دل منفعل بسی گذرد بی تو بسی

ای چه
بر جای بنی آدم ز روح ملک قالب تهی
این کوچه مستعمل بسی گذرد بی تو بسی

آزاده به باده وسال شب عیتی آگهی
به عصمت نفس

جان داده به جام حال شب بیتی آگهی
به رغبت نفس

گلگونه به صبح نو نمود ار بوا
به بیم و رجا

ای جذبه د انفعال شب بیتی آگهی
به عزت نفس

تزئینِ شبستانِ تب و تابِ جمال

آرائشِ بزمِ دل بہ فانوسِ خیال

زمزمہ وریِ ساز بہ اندازۂ ذوق

صورت گریِ ناز بہ اندازِ کمال

پیمانہ، خمارِ چشمِ ساقی بھی تو ہے

میخانہ، عیارِ چشمِ ساقی بھی تو ہے

مستوں کی بڑی بات ہے، اللہ اللہ

مستوں میں شمارِ چشمِ ساقی بھی تو ہے

یہ جسم، یہ مستی عنب میں کیا ہے؟
یہ اتنا احساس طرب میں کیا ہے؟
جھک جھک کے اٹھتی ہے یہ شمع کی لو
بجھ سے تیرے ہونٹوں کے عقب میں کیا ہے؟

بالیدگیٔ شوق کا بھی پاسدار ہے
تابندگیٔ ذوق کا بھی پاسدار ہے
عکاسیٔ زندگی ہے مقصود اگر
تمثیل میں مافوق کا بھی پاسدار

از قوم آرا ہیں انصرامِ خشک و تر ہیں
پھیلے ہوئے ہیں جالِ جسم و سر ہیں

بہ آتش زیرِ پا ہے آرزو ذرۂ خاک
اک عالمِ ابتلائے وحشت و دَر ہیں

با شاهد بزم مست کافر بستن

بر سنگ تپش عمر می و ساغر بشکستن

تا چند به ناکرده گناهان بود شمار

افسرده دلی سے دامن تر بستن

پیمانه بکف بجان بهار آمده‌ای
محفل بیمه و شوخ و قشنگکار آمده‌ای
میخوار تو خود بخود بکس جایش
ساقی کی نگاه بود این خمار آمده‌ای

پھولوں کے تبسّم کو جوانی بخشی
بادِ سحری کو زندگانی بخشی
اے نقشِ بہار! اے غبارِ سرِ راہ
کس نے تجھ کو ہستی کی نشانی بخشی

ہے شوخیِ گفتار سے وابستہ
ہے ندرتِ اظہار سے وابستہ
لیکن یہ طلسمِ حرف و صوت و آہنگ
ہے رخنۂ افکار سے وابستہ

خود نفس سے اپنے ڈر رہے ہیں ساقی
ڈر ڈر کے گناہ کر رہے ہیں ساقی
کس طرح گزر رہی ہے کیا تجھ سے کہیں؟
پیمانۂ عمر بھر رہے ہیں ساقی

احساس کی تازگی بڑھا دیتے ہیں
آفاق کی دلکشی بڑھا دیتے ہیں
کس درجہ ہیں دلفریب خوابوں کے طلسم
انسان کی زندگی بڑھا دیتے ہیں

افکار کی آزروی بپا زنجیرے
پنداری نقشِ تصویرے
تخلیق کو فعلِ اضطراری سمجھے
عالم کو سمجھی خوابِ بے تعبیرے

ہر گام پہ پیچ و تاب کا سا عالم
ہر لمحے اک اضطراب کا سا عالم
کیوں یاد دلا رہے ہیں عہدِ شباب
وہ ریگِ رواں موجِ خواب کا سا عالم

تصویر بنتی ہیں میں انگلی سے بکھر جاتا ہے
نظروں کو حیلے سے جیسے ہو کر جاتا ہے

احساس فزوں تر بڑھا آتشِ شوق
پیکر سے بڑا کہ کچھ اُکھڑ جاتا ہے

ہر عشوہ ہے نازنیں ادائی کی تمنا
ہر غمزۂ وہ ہے دل ربائی کی تمنا

آئینہ بھی ہے موردِ الزام کہ
عالم ہے ادائے خودنمائی کی تمنا

تنویرِ رخِ حیات ہے شعلۂ عشق
صورت گرِ کائنات ہے شعلۂ عشق
ہے عقل و خرد و باعثِ تزئینِ حیات
آئینۂ حسنِ ذات ہے شعلۂ عشق

خلّاقِ تصوّرات ہے شعلۂ عشق
آفاقِ تجلیّات ہے شعلۂ عشق
معراجِ کمالِ بندگی کی سوگند
میثاقِ تعیّنات ہے شعلۂ عشق

بلبل کی چیخ کو ترنم سمجھے
غنچوں کی چیخ کو تبسم سمجھے
فریاد کہ کائنات ہے نالہ کناں
اے کاش کوئی طرزِ تکلم سمجھے

آئینہ گر بھی ہے شعلۂ آواز بھی ہے
خود حسن بھی ہے حسن صنم ساز بھی ہے
جس کی ہر ادا ہوئی ہے عالم آشوبی
وہ صدر نشین پردۂ راز بھی ہے

شوقِ صبر آزما ہے، یہ ہستی کیا ہے؟
فتنہ کارِ وصل ہے، یہ ہستی کیا ہے؟

متخالف، متضاد

یادِ مستی کس ہے، یہ ہستی کیا ہے؟
اک حسنِ بینشا ہے، یہ ہستی کیا ہے؟

تشکیل، تصوّر و تخیّل سے بعید
تعدیل، تغیّر و تبدّل سے بعید
اے جذبۂ حُسنِ کار، ممکن ہی نہیں
تکمیل، تصنّع و تأمّل سے بعید

عرفانِ عالمِ تصور، ہستی کیا ہے؟
پندارِ پابندیِ عمر، ہستی کیا ہے؟

تابانیِ رخ، خندۂ گل، آوازِ پری
ہستی کہ کہاں، رقصِ مستی کیا ہے؟

تهذیب جز دوری مستی کیا ہے؟
خمیازه کیف غم پی مستی کیا ہے؟

جوانی شوق از آغاز تا بہ عدم
سکینہ کہ آسائش مستی کیا ہے؟

ہر موج میں گرداب نہاں ہے ساقی!

ہر موج پہ طوفاں کا گماں ہے ساقی!

انسان کے باطن میں پنہاں ہے جو جسم

وہ موج حوادث میں کہاں ہے ساقی!

ہر سمت کشش شوق سوگوارا ہے
ہر حال میں دل کو مضطرب پایا ہے
ہر چند کہ گرد و پیش ہیں یہ تماشا غم آگین
عالم میں کہیں دھوپ کہیں سایہ ہے

کیوں اب بھی چھٹی ملی ہے غمِ دوراں کی اگر فرصت؟

دیکھیں تو نہیں شاید غمِ جاناں کی اگر فرصت!

کیا کیا دلِ شیفتہ فرو کار کیا دورِ فلک!

سمجھو تو نہیں زلفِ پریشاں کی اگر فرصت!

غنچوں کے لبوں پہ سرخوشی جھوم اٹھے
یا دوشِ صبا پہ بیخودی جھوم اٹھے
وہ نغمہ سرا ہو تو فضا رقص کرے
وہ رقص کرے تو زندگی جھوم اٹھے

برق پیکروں کی حقیقت کیا ہے؟
اِس غیب و حضور کی حقیقت کیا ہے؟
تو سامنے آکے اور لطیف ہوتا ہے
ادراک و شعور کی حقیقت کیا ہے؟

میزانِ خسرِ دیدہ تول کر دیکھا ہے
دامانِ جنوں میں رول کر دیکھا ہے
جاں سوزیِ شمعِ آرزو کی سوگند
انمول ہی زیست مول کر دیکھا ہے

ہنگامۂ کائنات ہے پیچ بہ پیچ
جولاں گہِ زندگی ہے عجب بے انداز
اک کشمکشِ مدام حاصل جس کا
ہے بندگیٔ نفس کی کھٹکا و تعبیر

کیا یار کی ہوا عشوۂ ترکانہ کے بعد
کیا بات بنی ہوئی نعرۂ مستانہ کے بعد

اک فتنہ اٹھا موجۂ مے سے پہلے
اک حشر اٹھا گردشِ پیمانہ کے بعد

شیرازۂ جاں بکھر رہا ہے ساقی
دم دل پہ گراں گزر رہا ہے ساقی
لا ساغرِ مے ڈوب چلی ہیں نبضیں
ہستی کا نشہ اُتر رہا ہے ساقی

افسونِ ہوائے رنگ و بو ٹوٹ گیا
نیرنگِ طلسمِ آرزو ٹوٹ گیا
افسانۂ گردشِ فلک ختم ہوا
ساقی سے گرا ایک سبو ٹوٹ گیا

خلاقیِ حسنِ آرزو رقص میں ہے
صناعیِ کیفیتِ ساز و نور رقص میں
افسونِ خمارِ چشمِ ساقی کی قسم
ہستی ہے پیامِ موجِ مے سبو رقص میں

ہاو ہُو

تخصیص مکان و لامکاں سے پہلے
تخلیق زمین و آسماں سے پہلے

سب شمع سے روشن تھا یہ فانوسِ وجود
مد و مد و تکبیر و سرِ کہاں سے پہلے

عالم تھا دھواں دھواں جہاں سے پہلے
اڑتا تھا غبار کارواں سے پہلے

خود دوست کو بھی قرار حاصل نہ ہوا
بیکسیں حسنِ اتفاق یاں سے پہلے

بوجھل سا سکوت تھا ندا سے پہلے
تھا ہوش کسے بانگِ درا سے پہلے
آئینۂ رنگ و بو میں عکس لیکن
بے رنگ تھا اظہارِ انا سے پہلے

کیا وہ دور تھا اس دور زماں سے پہلے
تھی کوئی منزل اس جہاں سے پہلے

کیوں خلعتِ مستعار بخشا ہے یہیں
یہ کیا تھی حیات نا آگہاں سے پہلے

صحرا کا عمل تھا، گلستاں سے پہلے
اُٹھتے تھے بگولے سے بیاباں سے پہلے
طاری تھا جہاں پہ ایک ہُو کا عالم
گُلکاری و دستِ ناتواں سے پہلے

جاں کاہیٔ حسنِ ارتقا سے پہلے
جاں سوزیٔ عرفانِ انا سے پہلے
خطرے میں گھرا ہوا تھا انساں کا وجود
جاں بخشیٔ نیرنگِ خطا سے پہلے

راہیں تھیں نظر بہ راہ رواں سے پہلے
منزل بھی تھی منتظر کارواں سے پہلے

ویرانہ دل پذیر تھی یہ دنیا
انسان کے قدموں کے نشاں سے پہلے

سر پہ تھا گراں بارِ عطا سے پہلے
تھا طوقِ گلو بندِ وفا سے پہلے
اس پر بھی کڑی دو نصیحت تیاری
تھا صبرِ بلا تیرِ قضا سے پہلے

تعیّنِ روا و ناروا سے پرے
تمیزِ سزا و ناسزا سے پرے

آدمی کی سرشت پہ ہنسی آئی
نسیاں کا شکار تھا خطا سے پرے

دل آگیں تھا وفورِ غم زباں سے پیل
شمع تھا نورِ یزداں فزا سے پیل
بت خانہ بنا ہوا تھا خود کعبہ بھی
قبلہ بھی تھا آگ قبلہ نما سے پیل

محروم دو عالم تھا ثنا سے پہلے
بیگانۂ لطف تھا دعا سے پہلے
انسان کو معلوم نہ تھا اپنا مقام
معراج حبیب کبریا سے پہلے

۴۳۵

تزئینِ حسن ہیں رنگ و بو سے پہلے
تشکیل طلسم آرزو سے پہلے
بے پردہ ہوا صورت افلاک سے حسن
ہنگامہ نہیں ہاؤ ہو سے پہلے

سیری و تشنگی

غنچه که تبسم جانفزا آورده است
تا از که شعاع و ضیا آورده است
لب گویایی
نغمه که تشنه آورده است
لب تشنه که حرف مدعا آورده است

ببیں کہ نگاہ میں بسا آتی ہے
سوسن کہ صفا گل اُس پہ چھا آتی ہے
چشم براہ
اک گنج کہ مایل سے لپٹی
اک حسن کہ آیا بہ بیا تو ہے

ای شاعرِ خوش‌نوازِ نوآورترین
ای مطربِ خوش‌سخنِ صداآورترین
ای سازگرِ بی‌تابِ بی‌نغمون لیلی
از جمله سرود و ادبا کوترترین

بے برگ و نوا ہیں برگ و نوا اکثر ہیں
مجبورِ وفا ذوقِ وفا اکثر ہیں

ہے داد طلب تحمّلِ جورِ بتاں
صہبا ستمِ ناشکیب انا اکثر ہیں

پندار ابر بر مسنگی قیس کو ترس
بیاباں کی مفلسی حبیب کو ترس
بے لطفی زندگی ہوس کی خواہاں
بے بسی بندگی خدا کو ترس

پیمانه بکف و دست بسر گیسوی توست
سرمست الست بی من و جام سر توست
نقاش نگارخانهٔ چین و هندی
تیغ هم ز ابروی کج سر توست

اے خاتمِ پیمبر وارث نبیں کو تسلیم

اے یوسفِ مصر، مہ جبیں کو تسلیم

اے دشمنِ دل آرا، زمیں پہ چراغ

اے مرشدِ حق، حسنِ یقیں کو تسلیم

اک قالب مہر میں نازک تر ہے
اک چشم صدف با آبدار تر ہے
اک غمزہ کہ مقدور نہ جانے اپنا
اک عشوہ کہ شرح معتبر تر ہے

ای رند ابد و قوت چنین نیکوتر است
ای مست به سر و در آ که نیکوتر است
ای فاتح دوران به احسان پیش است
ای خواجه به غم و رنج بندی نیکوتر است

اے ابروئے خم ستمگارہ گزرتی ہے
اے سجدہ گزاران لب دار گزرتی ہے
اے شاہد رعنا بطلبگار نگاہ؟
اے اہل نظر حسن نظر سے گزرتی ہے

گل پوشش بابا یمین شد گل توست
گل ستم نه گر ز نو صبر گل توست
گل ماه سیمین که او چاه نخشب کی بالاش
گل زنده خورشید بر گل توست

اک سالک اُدھر، جن نظر آتا ہے
اک حامل ایران انجمن آتا ہے
خود اہل وطن بات نہ سمجھیں شاید
اک صاحب ادراک سخن آتا ہے

حیرت و درماندگی

یہ جبر کہ اختیار، فطرت کیا ہے؟
اس خاک کے پتلے میں کس کی حکمت کیا ہے؟
اس سے ہے کہ
بالیدگی آزاد سے فطرت کو
یہ حسن کہ تمہید و مشیت کیا ہے؟

غم عین جو تو سہی پاؤ تو مسرت کیا ہے؟
زحمت ہی مقدّر ہو تو راحت کیا ہے؟

یہ عکس بھی ہیں سایہ بھی الٰہی توبہ
یہ حسن ـ سرِ تشنۂ تشبیہ کیا ہے؟

یہ حشر ہے یہ نشر ہے یہ قیامت کیا ہے؟

یاد آئیں گے گناہ، اجی طاعت کیا ہے؟

سخن چینِ داغِ آرزو کیوں ہے یہ دل؟

یہ حسن کہ تیشۂ مشیت کیا ہے؟

تن اور بدن کی قدر و قیمت کیا ہے؟
اس تن سے بغیر جان کی صورت کیا ہے؟
ہستی بھی عدم بھی ارتقا کی منزل
یہ حسن ہے کہ تتمۂ مشیت کیا ہے؟

قلب اور ضمیر کی فضیلت کیا ہے؟
اے مصحفِ نفس اور یہ فطرت کیا ہے؟
انسان فرشتہ بھی ہے شیطان بھی ہے
پھر سررشتۂ مشیت کیا ہے؟

یہ سعیِ نشاطِ زیست وصلت کیا ہے؟
اک وقفۂ جاں گسل ہے تو وقت کیا ہے؟
کیوں یاد ہے کیفِ وصل اٹھ جاتا ہے؟
حسن کرشمۂ مشیت کیا ہے؟

اک شعبدۂ نظر ہے اگر ہیئت کیا ہیں ہم
کیفیتِ ذہنی ہے بصارت کیا ہیں ہم

اک دامِ زمیں ہے اگر ایمائے اشارہ و خلوص
چمن کرشمہ ہے بیت کیا ہیں ہم

سرمایۂ نازِ عیش و عشرت کیا ہے؟
اکسیرِ آذرِ محبت سازیِ دولت کیا ہے؟
کیوں زر سے تمام عیب چھپ جاتے ہیں؟
حسنِ کششِ مشیت کیا ہے؟

اس تلخیٔ دوراں میں حلاوت کیا ہے؟
اس عمرِ گریزاں میں سعادت کیا ہے؟

تعمیر فنا پذیر و تخریب انجام!
پھر حسنِ کرشمۂ مشیّت کیا ہے؟

اصلیت اخلاص و محبّت کیا ہے؟
یہ جہاں ہے خواب تو حقیقت کیا ہے؟

شرمندۂ تعبیر نہیں کوئی خواب
پھر حسن کے ستم، مشیت کیا ہے؟

نسیان و قصور کی رعایت کیا ہے
انعامِ گراں بارِ امانت کیا ہے
یہ لغزشِ پا موجبِ تعزیر ایسی کیوں ہے
یہ حسنِ کرشمۂ مشیت کیا ہے

پیچ و خمِ گیسوئے فطرت کیا ہے
اس پردۂ رنگ کی رازبیں حقیقت کیا ہے
انسان ہے مبتلائے صد ظن و گماں
چیں بر جبینِ مشیّت کیا ہے

مشتاقِ جمال، کیفِ حسرت کیا ہوئی

آئینہ خصالِ حسن پرست کیا ہے

خود بینی ہے باعثِ جنگ تابکہ

یہ حسن کہ تمہیدِ مشیت کیا ہے

ای تشنگی شوق ببین لذت کجایی

ای کرب نبود ببین سعادت کجایی

سی آزادگه

از سنگی بی نشط کجایی

چسن گسر پشت پیشه کجایی

اک حسرت منفعل ہے طاعت کیا ہے

اک گوشۂ خاص دل ہے جنت کیا ہے

ہے کشمکش بیم و رجا حاصل زیست

یہ حسن سرشت مشیت کیا ہے

اِس احسنِ تقویم کی غایت کیا ہے؟
اِس جوہرِ تخلیق میں ندرت کیا ہے؟
گر فتنۂ گرد و باد و آب و آتش
پھر حسن کہ شیشہ در مشیت کیا ہے؟

تزئینِ سعادت و نحوست کیا ہے؟
معیارِ شرافت و رذالت کیا ہے؟
جس کو علم عطا ہو وہ صاحبِ لوح و قلم
پھر حسن سے تشنۂ مشیت کیا ہے؟

اس عالم ایجاد کی غایت کیا ہے؟

اس جوہر اضداد میں حکمت کیا ہے؟

پیچیدہ بخود شعور تو بیچ میں آئے

حسن کہ تشنۂ مشیت کیا ہے؟

رنگ و بُو

تصویرِ نگاہِ روشن سی ہے
احساسِ مسرت اک عجب سی ہے
دیتا تھا کسی سے اور بوئے شمیم
انداز و کرشمہ و ادا سی ہے

تھی حسن میں اک کشش ادا سے پہلے
دل خون ہوا نہ آکر حجاب سے پہلے
عشق ایک حقیقت ہے مگر جلوۂ عشق
کردار تھا شوخی حیا سے پہلے

ملتی نہیں گل وصل صبا سے پائے
کھلتے نہیں رخ زناں حیا سے پائے
سمجھیں رخ گل نہ کی لو دینے لگائیں
افسوس کہ مہر و وفا سے پائے

موجِ نفسِ غنچۂ رُستا سے پیدا
دورِ مئے احساس رُبا سے پیدا
کیا تھے لب و رخسار کے سادہ خطوط!
مدِّ خطِ ابعادِ زماں سے پیدا

افسونِ نگاہ دل کشاں سے پیدا
سحرِ لبِ اعجاز نما سے پیدا

غارت گرِ تمکین بھی کسی کی ادا
دل بردگیِ ناز حیا سے پیدا

سنبل و سمن چشمِ حیا سے پیدا
رقص و رم آہوے صبا سے پیدا
وارفتگیِ شوق کا اظہار کہ
خود رفتگیِ بندِ قبا سے پیدا

آہنگِ تبسمِ جانفزا سے پیدا
مستانہ خرامیِ صبا سے پیدا
سیرابیِ لب سے غنچۂ دل کھل اٹھا
رسوائیِ خوابِ ناز سے پیدا

مشّاطگیٔ زلفِ دوتا سے پہلے
عشوہ گریٔ جلوہ نما سے پہلے
اک موجِ جنوں خیز تھی خوشبوئے بدن
بے وقعتیٔ رنگِ قبا سے پہلے

نیرنگیِ شوخیِ ادا سے پیہم
رعنائیِ جلوۂ قبا سے پیہم
کیوں جامے سے باہر ہوئی جاتی ہے کلی؟
آوارگیِ نکہتِ صبا سے پیہم

بیداریٔ وقتِ ستم ادا سے پیالے
سیمابیِ شوخیِ حیا سے پیالے
کیفیتِ نیم خوابیِ چشم ہے یاد
دامن کشیِ خوابِ وفا سے پیالے

بے تابیِ حرفِ مدعا سے پہلے
گستاخیِ دستِ نارسا سے پہلے
لغزیں خرامی تھی جسارت آموز
چھلکے تھے سبو لغزشِ پا سے پہلے

نظارہ برقِ دلِ عشق سے ہے
ہستی جو تپشِ حباب سے ہے

آں غنچہ ہا شگفتہ کہ شوقِ وصال
پیمائی دامنِ قبا سے ہے

یہ مشتری بن اک کہ خیال سے پیدا
جمعِ ہستی سرابِ نقاب سے پیدا

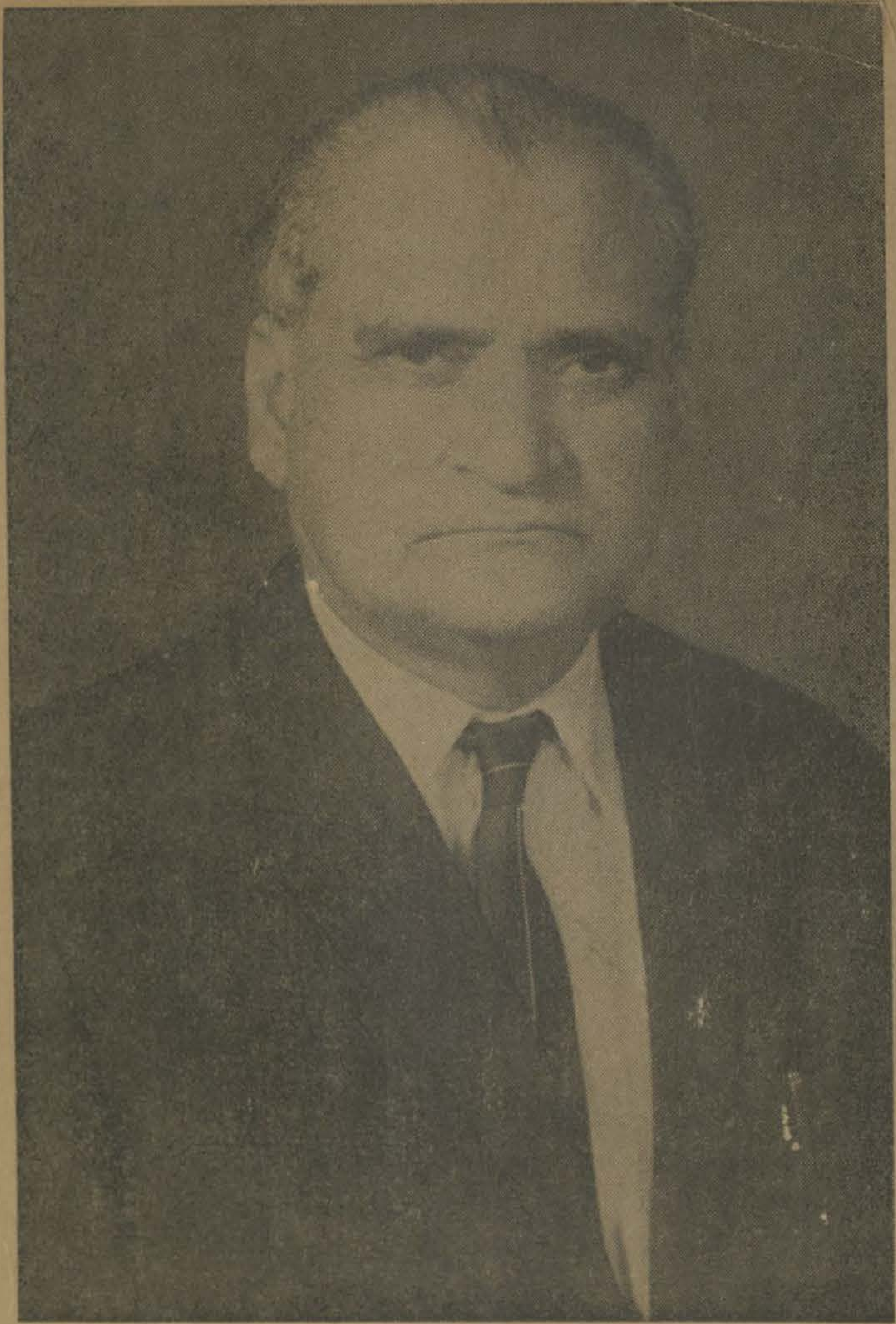
دشوار تھی پرکاوشِ خود بینیِ حسن
سہل نکہ عقدہ پرستش سے پیدا

گلگونیٔ مزرعِ حنا سے پیدا
سیرابیٔ وادیٔ وفا سے پیدا
ہر موجِ تلاطم تھی گہر آغوش نشیں
موتی بنتے صدف نما سے پیدا

سرشاریِ چشمِ فتنہ زا ہے سب یہ
غمازیِ نازِ دلستاں ہے سب یہ
اے شعلۂ شمع ستی کیوں سرد ہوا
زرتابیِ فانوس نما ہے سب یہ

به کیفیت تماشا عجائب صدا است پیدا
به رنگ تماشا ز نقش نوا است پیدا

به سوز تماشا ز نی زیر و بم نغمه و ساز
از آهنگ دل نغمه است پیدا



سید اقبال حسین نام ـ شوقی تخلص ہے ـ ۱۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو دھلی میں پیدا ھوئے ـ دھلی یونیورسٹی سے ۱۹۴۲ء میں بی کام اور ۱۹۴۵ء میں ایم اے (معاشیات) کیا ـ ۴۳ء سے ۴۷ء تک اینگلو عربک اسکول دریاگنج دھلی میں کامرس اور معاشیات کا درس دیا ـ ۱۹۴۷ء میں حمیدیہ کالج بھوپال میں معاشیات کے لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ھوا ـ ۱۹۴۸ میں کراچی آگئے اور آسوقت سے ملک کے ایک اھم اور صنعتی ادارہ سے وابستہ ھیں ـ اور تجارتی صنعتی اور ادبی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ھیں ـ

قیمت بارہ روپے

دپوش، فخری پرنٹنگ پریس میں چھپا